اہل حق کی نصرت و تائید اور اہل باطل کی تردید میں اٹھایا جانے والا قلم سب سے بہترین قلم ہے۔

(امام ابن قیم رحمہ اللہ۔ التبیان في أیمان القرآن: ص: ۳۱۰)

شمارہ نمبر ②

ماہنامہ

سلفی منہج

جلد: ۱- شمارہ نمبر: ۲- شعبان ۱۴۴۴ھ، فروری - مارچ ۲۰۲۳ء

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيَأْتِيَنَّ عَلَى أُمَّتِي مَا أَتَى عَلَى بَنِي إِسْرَائِيلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ حَتَّى إِنْ كَانَ مِنْهُمْ مَنْ أَتَى أُمَّهُ عَلَانِيَةً لَكَانَ فِي أُمَّتِي مَنْ يَصْنَعُ ذَلِكَ وَإِنَّ بَنِي إِسْرَائِيلَ تَفَرَّقَتْ عَلَى ثِنْتَيْنِ وَسَبْعِينَ مِلَّةً وَتَفْتَرِقُ أُمَّتِي عَلَى ثَلَاثٍ وَسَبْعِينَ مِلَّةً كُلُّهُمْ فِي النَّارِ إِلَّا مِلَّةً وَاحِدَةً قَالُوا وَمَنْ هِيَ يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي. (سنن الترمذي: 2641)

عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”میری امت کی بعینہ وہی صورت حال ہو گی جو بنی اسرائیل کی ہو چکی ہے، (یعنی مماثلت میں دونوں برابر ہوں گے) یہاں تک کہ ان میں سے کسی نے اگر اپنی ماں کے ساتھ اعلانیہ زنا کیا ہو گا تو میری امت میں بھی ایسا شخص ہو گا جو اس فعل شنیع کا مرتکب ہو گا، بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹ گئے اور میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی، اور ایک فرقہ کو چھوڑ کر باقی سبھی جہنم میں جائیں گے، صحابہ نے عرض کیا: اللہ کے رسول ﷺ! یہ کون سی جماعت ہو گی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”یہ وہ لوگ ہوں گے جو میرے اور میرے صحابہ کے نقش قدم پر ہوں گے“۔

www.salafimanhaj.info

اہل حق کی نصرت و تائید اور اہل باطل کی تردید میں اٹھایا جانے والا قلم سب سے بہترین قلم ہے۔

ماہنامہ سلف منہج

جلد:۱-شمارہ نمبر:۲-شعبان ۱۴۴۴ھ، فروری-مارچ ۲۰۲۳ء

زیر اشراف: فاروق عبد اللہ نراین پوری
ابو احمد کلیم الدین یوسف

مدیر: حافظ علیم الدین یوسف

نائبان: عبد اللہ عبد الرشید مدنی
حافظ فیضان عالم

معاونین: محمد آصف سلفی
حافظ آفتاب عالم
کامران اشرف سلفی

منہج سلف کے نام سے نشر ہونے والا یہ ایک برقی مجلہ ہے جس کا مقصد خالص سلفی دعوت کی نشر و اشاعت اور منحرفانہ وملحدانہ افکار کی بیخ کنی ہے۔

مولانا اسماعیل سلفی رحمہ اللہ

"جماعت اہل حدیث نے مسلک کی تبلیغ میں ہمیشہ تساہل برتا، ہم اور ہمارے مبلغ اپنے مواعظ وتقاریر میں صلح کل پالیسی اختیار فرماتے رہے، تلخی، تیزی، بدزبانی یقیناً بُری چیز ہے لیکن اچھے لفظوں میں حقیقت کی وضاحت میں تساہل کرنا عیب ہے۔ قادیانی، ومنکرین حدیث اپنے خیالات کے اظہار میں جھجک محسوس نہیں کرتے لیکن ہم لوگ ہمیشہ صلح پسندی میں حقیقت پسندی سے گریز کر جاتے ہیں، اب تو کچھ ایسے حضرات پیدا ہوگئے ہیں جو کہ اہل حدیث کے ذکر سے شرماتے ہیں"۔ (مقدمہ حسن البیان: ص:۱۹)

فہرست عناوین

اداریہ		۳
فکری انحراف: اسباب وعلاج (قسط ثانی)	فضیلۃ الشیخ محمد اشفاق سلفی	۴
احادیث نبویہ پر راشد شاذ کے شبہات کے جوابات (قسط اول)	ابو احمد کلیم الدین یوسف	۹
آیت "وَمن لم يحكم بِمَا أنزل الله فَأُولَئِك هم الْكَافِرُونَ" کا صحیح معنی ومفہوم، اور غور وفکر کے چند زاویے (قسط اول)	فاروق عبد اللہ نراین پوری	۱۸
اہل بدعت کے ساتھ تعامل، منہج سلف، اکابر اہل حدیث کا طرز عمل، بعض اشکالات اور ان کا ازالہ	ضیاء الحق تیمی	۲۳
فضائل ماہ شعبان اور بدعات	فضیلۃ الشیخ محمد اشفاق سلفی	۳۰
کیا مسلم حکمرانوں کے خلاف خروج (بغاوت) مختلف فیہ مسئلہ ہے؟ (قسط ثانی)	حافظ علیم الدین یوسف	۳۸
الولاء والبراء کا صحیح معنی ومفہوم (قسط ثانی)	عبد اللہ عبد الرشید مدنی	۴۵
قرآن مجید کی لغوی تفسیر: مفہوم وضوابط (قسط ثانی)	حافظ فیضان عالم	۵۰
اہل بدعت سے علم حاصل کرنے اور ان کی تقریر وغیرہ سننے کے تعلق سے سلف صالحین کا منہج (قسط ثانی)	مامون رشید بن ہارون رشید سلفی	۵۳
منظومة البيقونية في مصطلح الحديث: تعارف اور شروحات (قسط ثانی)	ابو المدیح بلال الخلیلی	۶۰

اداریہ

اسلام دین وسطیت ہے، ہر معتدل، عدل انصاف اور منتخب اور بہترین شے کو وسطیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی طرف اللہ رب العالمین نے سورہ بقرہ میں اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:"وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا" [۱] (اور ہم نے اسی طرح تمہیں امت وسط بنایا)۔ اور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "إِنَّ الدِّينَ يُسْرٌ " [۲] ((بلا شبہ، دین بہت آسان ہے))۔ یعنی ہمارے دین میں تشدد اور سختی نہیں ہے۔ ایک دوسری حدیث میں آپ ﷺ فرماتے ہیں: "لَا تُشَدِّدُوا عَلَى أَنْفُسِكُمْ فَيُشَدَّدَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ"۔ [۳] (اپنے آپ پر سختی نہ کرو، ورنہ اللہ تمہارے اوپر سختی فرمائے گا)۔ علاوہ ازیں آپ ﷺ نے حد سے تجاوز کرنے والوں کے حق میں بد دعا کرتے ہوئے فرمایا: " هَلَكَ الْمُتَنَطِّعُونَ"، [۴] (غلو کرنے والے ہلاک ہوگئے) جو کہ تشدد کی ایک قسم ہے۔

واضح ہو کہ نصوص شریعت میں فہم صحابہ کا التزام اور زندگی کے تمام شعبوں میں احکام الٰہی کی پابندی ہر مسلمان پر واجب ہے، جسے التزام شریعت یا دینداری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

المیہ یہ ہے کہ بعض مسلمان بھی دینداری اختیار کرنے اور شریعت کی پاسداری کو تشدد سے تعبیر کرتے ہیں، جبکہ اسلام نے معصیت الٰہی کو تشدد بتایا ہے یا پھر دین میں اپنی من مانی کرنے کو تشدد سے تعبیر کیا ہے۔ حقیقی اعتدال کا مفہوم یہ ہے کہ آپ ﷺ اور آپ کے اصحاب کے طریق کو عقیدہ و عمل اور دیگر دینی، دنیوی اور اخروی امور میں اسوہ اور نمونہ بنایا جائے۔

دین اسلام کی اس قدر واضح تعلیم کے باوجود اعدائے اسلام نے اسلام کو بدنام کرنے کے لئے اس لفظ کا بے جا استعمال کیا، چنانچہ اہل مغرب نے اسلام کو تشدد کا مذہب باور کرانے کی ناروا کوششیں کرتے ہوئے کذب وافترا کی تمام حدیں پار کی، جبکہ لبرلز اور ملحدین کے طبقے نے بھی اس موقع کا بھرپور فائدہ اٹھایا، چنانچہ ان کے نزدیک اسلامی احکامات کا التزام کرنے والے علما اور عوام متشدد دین کی کیٹیگری میں آتے ہیں، بلکہ افسوسناک امر تو یہ ہے کہ منہج صحابہ پر چلنے والوں کو بعض لوگوں کی جانب سے متشدد ہونے کا طعنہ دیا جاتا ہے۔ وہیں دوسری جانب نبی اکرم ﷺ کے خلاف سخت بد زبانی کرنے والوں کو دنیا تحفظ فراہم کرتی ہے، قرآن کریم کو جلانے اور اس کی توہین کرنے کو آزادی سے تعبیر کیا جاتا ہے، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت آمیز جملوں اظہار رائے کی آزادی کا نام دیا جاتا ہے۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

---

(۱) البقرۃ، آیت: ۱۴۳۔

(۲) صحیح البخاری: (۳۹)۔

(۳) مسند أبی یعلی الموصلی (۳۶۵/۶)۔

(۴) صحیح مسلم (۲۰۵۵/۴)۔

فکری انحراف: اسباب وعلاج (قسط ثانی)

فضیلۃ الشیخ محمد اشفاق سلفی
مدرس دارالعلوم احمدیہ سلفیہ، دربھنگہ (بہار)

فکری انحراف عہد نبوت کے بعد:

عہد نبوی میں جب کسی کے فکر میں کسی طرح کی بے اعتدالی دیکھی گئی تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً اس کی اصلاح اور درستگی فرمائی، عہد نبوی کے بعد جب اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا اور مختلف رنگ ونسل کے لوگوں نے اسلام قبول کیا تو ان میں سے بہت سارے ایسے افراد جن کے دلوں میں اسلام کی شمع پوری طرح فروزاں نہیں ہو سکی تھی، وہ اپنے ساتھ سابقہ ادیان ومذاہب کی خرافات اور بے اعتدالیاں بھی لیکر آئے جن کی کچھ مثالیں ہمیں تاریخ کے صفحات میں ملتی ہیں، یہ انحراف اور بے اعتدالی کئی پہلوؤں پر محیط تھیں، کہیں غلو کی شکل میں، تو دین میں کہیں تعنت اور تشدد کی شکل میں، تو کہیں تساہلی اور تقصیر کی صورت میں اور کہیں لایعنی بحث وتکرار کی شکل میں۔ ذیل میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

قرآن کریم کے متشابہات میں کلام کرنا:

بصرہ میں صبیغ بن عسل نامی شخص قرآن کریم کی ان آیات کی تفسیریں پوچھتا پھرتا تھا جو متشابہات کے زمرے میں آتی ہیں، چنانچہ امام ابوعبید الآجری نے الشریعہ [۱] میں سلیمان بن یسار سے یہ اثر نقل فرمایا ہے کہ صبیغ بن عسل مدینہ آیا اور لوگوں سے قرآن کریم کی متشابہات کی تفسیریں پوچھنے لگا، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو یہ اطلاع پہنچی تو انہوں نے کھجور کی چھڑیاں تیار کروائی، جب وہ انکے پاس آیا تو انہوں نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ اس نے کہا کہ میں اللہ کا بندہ صبیغ ہوں۔ حضرت عمر فاروق نے کہا کہ میں اللہ کا بندہ عمر ہوں پھر کھجور کی ان چھڑیوں سے اسے لہولہان کر دیا۔ اس نے کہا کہ امیر المؤمنین بس کیجیے میرے دماغ سے وہ بھوت اتر گیا ہے۔ علامہ عبد الکریم السمعانی نے الانساب [۲] میں لکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قاتل عبد الرحمن بن ملجم المرادی جو خارجی فکر کے بانیوں میں سے تھا، اسی نے صبیغ کو حضرت عمر فاروق کے پاس بھیجا تھا تاکہ وہ ان سے اس قسم کے سوالات کر سکے۔

فکری انحراف، اور بے اعتدالی کی اس راہ نے امت کو کتنا نقصان پہنچایا ہے اس سے امت کا تعلیم یافتہ طبقہ واقف ہے، ایسا نہیں ہے کہ فکری انحراف کی یہ مثالیں صحابہ کرام کے زمانے میں ہی ظاہر ہوئیں بلکہ عہد نبوت میں بھی ذوالخویصرہ التمیمی؛ جس کی

---

(۱)(۱-۴۸۴/۴۸۳)۔

(۲)(۳/۲۶)۔

عبادت اور زہد و تقوی کی مثال دی جاتی تھی، اس نے بھی اپنی فکری کج روی کا مظاہرہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کیا تھا، چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جعرانہ کے مقام پر ہوازن کے مال غنیمت کو تقسیم کیا تو ایک تمیمی شخص اٹھا اور کہا کہ: اے محمد عدل سے کام لو۔ آپ نے تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا: تمہاری بربادی ہو، اگر میں عدل سے کام نہیں لوں گا تو کون لے گا؟ حضرت عمر فاروق نے غصے میں کہا: کہ آپ اجازت دیں تو میں اس منافق کی گردن اڑادوں؟ آپ نے فرمایا: کہ ایسا مت کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ کہتے پھریں کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کر دیتے ہیں، پھر آپ نے فرمایا: کہ اس شخص کے کچھ اصحاب ہوں گے جو قرآن تو پڑھیں گے لیکن قرآن انکے حلق سے تجاوز نہیں کرے گا (یعنی قرآن فہمی سے محروم ہوں گے)۔ یہ دین سے ایسے ہی نکل جائیں گے جیسے تیر شکار کے جسم سے۔ (۱)

تاریخ نے دیکھا فکری انحراف کے شکار خوارج کی اس جماعت نے امت کو کتنا نقصان پہنچایا اور آج تک ان کی فکری کج روی کی نمائندہ تنظیمیں؛ داعش، القاعدہ، الاخوان المسلمون اور ان کی ذیلی شاخیں امت کو نقصان پہنچا رہی ہیں۔ اس فکری انحراف نے شام و یمن اور افغانستان و عراق کا چین و سکون درہم برہم کر دیا ہے۔

شیعی فکر کا ظہور:

خارجی فکر کے بعد جس فکر نے امت کو نقصان پہنچایا ہے؛ وہ شیعی فکر ہے، جو قرآن اور سنت نبویہ کی عین مخالف ہے، اس فکر کا بانی عبد اللہ بن سباء یہودی تھا جو صنعاء کا رہنے والا تھا، کہا جاتا ہے کہ جس طرح عیسائیت کے بگاڑ میں سینٹ پال نے کردار ادا کیا، اسی طرح اسلام کو ضرر پہنچانے میں اس شخص نے مرکزی کردار ادا کیا، اسی نے اپنے ہمنواؤں کے ساتھ مل کر جنگ جمل اور صفین کی آگ بھڑکائی، یہی وہ شخص ہے جس نے اسلام میں شخصیت پرستی کی بنیاد ڈالی جو فکری انحراف کی پہلی سیڑھی ہے، یہ کہتا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی ہیں، یعنی اپنے بعد آپ نے امامت و خلافت کی وصیت حضرت علی کے لئے کی تھی، بلکہ وہ انہیں الوہیت کے درجے پر فائز کرتا تھا، جسکی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کے بعض ساتھیوں کو آگ کے الاؤ میں ڈال کر جلا دیا۔ شیعیت اور رافضیت کی فکر نے ہر دور میں اسلام اور مسلمانوں کا شدید اور ناقابل تلافی نقصان کیا ہے، جو آج تک جاری ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ مسلمانوں کے منحرف فرقوں میں سب سے خطرناک اور اسلام کو نقصان پہنچانے والوں میں سب سے خبیث یہی فرقہ ہے تو مبالغہ نہ ہو گا۔ قاتلھم اللہ۔

دور حاضر میں فکری انحراف کی صورتیں:

موجودہ دور میں فکری انحرافات پوری قوت سے ظاہر ہو چکی ہیں، تواصل و تقارب کے اتنے پلیٹ فارمز دنیا میں ظاہر ہو گئے ہیں جن کی نظیر انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ظاہر ہیکہ جب فکر و نظر کی ترویج کے لئے حالات سازگار ہوں تو باطل طاقتیں سب سے پہلے ان سے استفادہ کے لئے لپکتی ہیں۔ چنانچہ آج گھر بیٹھے انسان ان کے باطل افکار و نظریات کا شکار ہو رہا ہے، اور ان

---

(۱) (صحیح بخاری: ۳۱۳۸، و مسلم: ۱۰۶۳)۔

افکار سے متاثر ہو کر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانیوں اور ہرزہ سرائیوں پر آمادہ نظر آتا ہے، زمین کی مسافتیں سمٹ گئی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک گھر کے افراد مختلف افکار و نظریات سے متاثر نظر آرہے ہیں، اس فکری انحراف کا نتیجہ ہے کہ ہم مسلم ممالک میں کبھی علمانیت اور جمہوریت کی اٹھتی ندائیں سن رہے ہیں تو کبھی آزادی نسواں کا پر فریب نعرہ گوش سماعت ہوتا ہے، کہیں اسلامی احکام و قیود سے آزادی کا غلغلہ بلند کیا جارہا ہے، کہیں جنسی بے راہ روی اور انارکی کو قانونی حیثیت دینے کی مانگیں اٹھ رہی ہیں، جب ہم ان فکری انحرافات کے اسباب وعلل پر نظر ڈالتے ہیں تو ذیل کے کچھ اہم اسباب ہمارے سامنے آشکارا ہوتے ہیں:

۱. دین کی صحیح سمجھ سے دوری: آج امت مسلمہ کا ایک بڑا طبقہ جس فکری انحراف کا شکار ہے اس کا سب سے بڑا سبب دین کی صحیح سمجھ سے محرومی ہے، جس کا نتیجہ ہے کہ جاہل اور بے دین افراد امت کے رہنما اور پیشوا بن گئے ہیں، وہ جہالت پر مبنی فتاوے اور احکامات صادر کرتے ہیں خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور بہت سوں کی گمراہی کا سبب بنتے ہیں، وہ دین کے مقاصد سے نابلد ہیں، اپنی خواہشات کے مطابق دین کی تفسیر و تاویل کرتے ہیں، قرآن کریم کی محکم اور واضح آیات کو چھوڑ کر ان آیات سے استدلال کرتے ہیں جو متشابہات کے زمرے میں آتی ہیں۔

۲. صحیح اسلامی تربیت کا فقدان: تربیت ہی وہ جوہر ہے جو خاک کو کندن بنا دیتی ہے، آج ہمارا مسلم معاشرہ اس پہلو سے دامن بچاتا نظر آتا ہے جس کا نتیجہ ہے کہ صحیح تربیت سے محروم بچے جب گمراہ اور منحرف افکار کے حامل افراد کے رابطے میں آتے ہیں تو آسانی سے انکے افکار وخیالات سے متاثر ہو جاتے ہیں۔

۳. صحابہ کرام اور سلف صالحین کے منہج سے دوری: اسلام پر چلنے اور دین کو صحیح طرح سے سمجھنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کو ہمارے لئے آئیڈیل قرار دیا ہے، اللہ کہتا ہے: "فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۖ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ ۖ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ"۔ (اگر وہ تم جیسا ایمان لائیں تو ہدایت پائیں، اور اگر منہ موڑیں تو وہ صریح اختلاف میں ہیں، اللہ تعالیٰ ان سے عنقریب آپ کی کفایت کرے گا اور وہ خوب سننے اور جاننے والا ہے)۔[1] دین کو کیسے سمجھنا ہے اور اس پر کیسے عمل پیرا ہونا ہے صحابہ کرام نے اسے برت کر دکھایا۔

۴. خواہشات کی پیروی: بہت سے ایسے لوگ جو فکری انحراف کا شکار ہیں، حق کی معرفت کے باوجود وہ حق کی پیروی کرنے سے صرف اس لئے جھجکتے ہیں کہ حق کی پیروی ان کی خواہشات سے متصادم ہوتی ہے۔

۵. خشیت الٰہی سے محرومی: جو چیز ہمیں گمراہی اور شر کے راستوں سے روکتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کا خوف ہے، ہمیں اسکے سامنے اپنے تمام اعمال کی جوابدہی کا احساس ہر طرح کے انحرافات اور گمراہیوں سے روکنے کا اہم ذریعہ ہے، اسلئے ہم دیکھتے ہیں کہ منحرف فکر کے افراد خوف الٰہی کی صفت سے محروم ہوتے ہیں۔

---

(۱)[البقرۃ:۱۳۷].

فکری انحراف سے بچاؤ کی تدابیر:

۱. **صحیح علم کا حصول:** جب تک انسان صحیح شرعی علم سے بہرہ ور نہیں ہوگا اس وقت تک وہ فکری انحرافات سے نہیں بچ سکتا۔ کیونکہ علم کی مثال تاریکیوں میں شمع کی سی ہے جو تاریک راہوں میں صحیح طریقہ پر چلنے میں ہماری مدد کرتی ہے۔ فکری ظلمات اور انحرافات کی یلغار کے اس مہیب دور میں صحیح علم ہی ہمیں ان تاریکیوں سے بفضل اللہ تعالی بچا سکتا ہے۔

۲. **علماء وصالحین کی صحبت اختیار کرنا:** علماء کرام وہ ہستیاں ہیں جو کسی قوم اور اس کی ترقی کی کشتی کے ناخدا ہوتے ہیں، وہ شبہات اور شہوات کے فتنوں کو ان کے ظہور سے پہلے ہی پہچان لیتے ہیں، امام ابن القیم رحمہ اللہ اپنی کتاب مفتاح دار السعادۃ[۱] میں لکھتے ہیں:" علم میں رسوخ حاصل کرنے والے علماء وہ گوہر نایاب ہیں، جن کے اوپر سمندر کی موجوں جیسی شبہات حملہ آور ہوں تو بھی انکے پاے استقامت میں تزلزل پیدا نہیں ہوتا کیونکہ انکے قدم اس دین کی معرفت میں گہرائی تک ثابت وراسخ ہوتے ہیں، وہ آسانی سے شبہات کو رد کر دیتے ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اہل بدعت اور ان کی مجالس سے دوری اختیار کی جائے، اسی میں ایک مسلمان کے دین کی سلامتی پنہاں ہے، فتنوں اور فتنہ پرور افراد سے دور رہنے کے لئے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کافی ہے، آپ نے فرمایا:" من سمع منكم بالدجال فلينأ عنه مااستطاع، فإن الرجل يأتيه وهو يحسب أنه مؤمن ، فما يزال به حتى يتبعه لما يرى من الشبهات"۔[۲] تم میں سے جو دجال کے نکلنے کی خبر سنے اسے چاہیے کہ حتی الامکان خود کو اس سے دور رکھے، کیونکہ انسان اسکے پاس آئے گا اس حال میں کہ وہ خود کو مومن سمجھتا ہوگا، برابر اسکے پاس رہے گا یہاں تک کہ اسکے شبہات کا شکار ہو کر اسکی پیروی کرنے لگے گا، امام ابن بطہ اپنی کتاب "الابانة الكبرى"[۳] میں اہل بدعت کے ساتھ مجالست اور انکی مخالطت کے برے اثرات کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:" میں نے بہت سے افراد کو دیکھا جو اہل بدعت کو گالیاں دیتے تھے اور انہیں برا بھلا کہتے تھے، یہاں تک کہ وہ ان سے مناظرے اور گفتگو کے نام پر ان کی مجلسوں میں شریک ہونے لگے اور کچھ عرصے بعد ان کے شبہات کے جال میں پھنس کر ان کے ہم مشرب ہوگئے، اسلئے ہم بعض صحابہ کرام کو دیکھتے ہیں کہ وہ اہل بدعت کی باتوں کو سننا بھی گوارہ نہیں کرتے تھے، جیسا کہ امام لالکائی نے ابن عمر ابن مسعود اور ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہم سے اپنی کتاب "شرح أصول اعتقاد أهل السنة والجماعة"[۴]، میں نقل فرمایا ہے۔

---

(۱)(۱/۱۴۰)۔

(۲)(أخرجہ أبوداؤد عن عمران بن الحصین، ح۴۳۱۹)۔

(۳)(ص: ۴۵۱)۔

(۴)(ص: ۱۸۸-۱۸۹)۔

۳. سوشل میڈیا اور مشکوک ویب سائٹس سے دوری اختیار کرنا: آج جبکہ دنیا انسانوں کی مٹھی میں آچکی ہے، بہت ساری اسلام دشمن تنظیمیں اسلام کے نام پر فکری انحراف کا کھیل، کھیل رہی ہیں، ایسی صورت میں مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ان علماء کی ہی تقاریر سنیں جو اہل علم کے نزدیک معروف اور مستند ہوں، دینی مسائل کی جانکاری حاصل کرنی ہو تو علما سے سیدھا رابطہ کریں۔

۴. فکری انحراف سے بچانے کے لئے مساجد کا استعمال: مسجد جہاں اللہ کی بندگی کا مرکز ہے وہیں اللہ کے بندوں کی فکری، اخلاقی اور سماجی اصلاح کا سنٹر بھی ہے، جب تک مساجد کا یہ کردار مسلمانوں کے درمیان فعال رہا امت ہر طرح کے فکری انحرافات سے محفوظ رہی، ضرورت اس بات کی ہے مساجد کے اس کردار کو پھر سے بحال کیا جائے۔

اگر عہد نبوی کا جائزہ لیتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ مسجد نبوی مسلمانوں کے لئے روح کی حیثیت رکھتی تھی، وہ بیک وقت جہاں اسلام کی نشرواشاعت کا مرکز تھی، وہیں کفر وشرک کے پیروکاروں سے لڑنے کے لئے ہیڈ کوارٹر بھی، وہ غریب ونادار مسلمانوں کے لئے ملجأ وماوی بھی تھی، علم کے متلاشیوں کی منزل مقصود بھی، سماج اور معاشرے کی اصلاح کا کام بھی یہیں سے انجام پاتا تھا، الغرض یہ کہ دین ودنیا سے متعلق ہر کام یہیں سے انجام پاتے تھے، ہم نے مساجد کے کردار کو محدود کر دیا، وہ بس پنج وقتہ نمازوں کی ادائیگی کی جگہ بن گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے مرکز سے کٹنے کے بعد ہم اپنے مقاصد سے غافل اور دور ہو گئے، ہم میں سے بہت سے افراد اہل باطل کے شبہات میں پڑ کر فکری انحرافات کا شکار ہو گئے۔ بلاشبہ جمعہ کے خطبات اور مساجد کے علمی دروس امت کے عقائدی اور فکری وعملی اصلاحات کی راہ میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ہر طرح کے انحرافات اور گمراہیوں سے محفوظ رکھے اور جب تک اس دنیا میں رکھے کتاب وسنت اور منہج صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر ثابت قدم رکھے۔ (ختم شد)۔

احادیث نبویہ پر راشد شاذ کے شبہات کے جوابات (قسط اول)

ابو احمد کلیم الدین یوسف
جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ

گزشتہ شمارے میں انکار سنت کے تعلق سے کچھ تمہیدی اور بنیادی امور پر ایک جامع تحریر قارئین کی خدمت میں پیش کی گئی، جس کا مقصد طلبہ اور عوام کو فتنہ انکار حدیث کی سنگینی سے آگاہی دینا ہے۔ عہد قدیم سے منکرین سنت کی ایک طویل فہرست ہے جن پر علماے سلف کی ناقابل فراموش تردیدی خدمات کتابی شکل میں موجود ہیں۔ خوارج ومعتزلہ اور دیگر فرقوں سے ہوتا ہوا یہ فتنہ سر سید کے ذریعہ برصغیر ہند وپاک پہنچا، فتنے کی اس آگ میں مولانا مودودی اور امین احسن اصلاحی نے تیل چھڑکنے کا کام کیا، فی الوقت اس فتنے کی لگام راشد شاذ نامی شخص نے سنبھال رکھی ہے۔ دراصل یہ سر سید اور مستشرقین کا چبایا ہوا لقمہ ہے جسے راشد شاذ نگلنے کی کوشش میں لگے ہیں۔ (ادارہ)۔

اعتراض: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، ابو بکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما نے تو احادیث جلا ڈالی تھیں، نیز عمر رضی اللہ عنہ تو اپنے دور خلافت میں کثرتِ روایت سے منع کرتے تھے پھر اتنی احادیث کہاں سے چلی آئیں؟

جواب: اولا: یہ سمجھنا بھی بہت ضروری ہے کہ: حدیث لکھنے کا حکم الگ چیز ہے اور حدیث کا شرعی حجت ہونا الگ چیز ہے، اول الذکر میں اختلاف ممکن ہے، لیکن حدیث کے شرعی حجت ہونے میں کسی کا بھی اختلاف نہیں، لیکن منکرین سنت اپنی کج فہمی کے سبب کتابت حدیث کے اختلاف کو حدیث کے حجت شرعیہ ہونے کا اختلاف باور کراتے ہیں، جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد قیس سے فرمایا: ((احفظوهن وأخبروا من وراءكم))۔[1] ان احادیث کو یاد کرلو، اور (جب یہاں سے لوٹ کر اپنے علاقے میں جانا تو) انہیں بھی ان احادیث کی تعلیم دینا جو تم نے مجھ سے سیکھی ہیں۔ ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: ((أَلاَ لِيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ مِنكُمُ الغائِبَ))[2] جو موجود ہے اور (احادیث کو سنتا ہے) اسے چاہیے کہ وہ ان احادیث کو ان تک پہنچا دے جو یہاں موجود نہیں۔ ایک تیسرے مقام پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((تَسْمَعُونَ وَيُسْمَعُ مِنكُمْ وَيُسْمَعُ مِمَّنْ سَمِعَ مِنكُمْ))۔[3] تم لوگ میری احادیث کو سنتے ہو، تمہارے بعد آنے والے لوگ ان احادیث کو تم سے سنیں گے، اور پھر ان کے بعد آنے والے لوگ ان احادیث کو ان سے سنیں گے جنہوں نے تم سے سن رکھا ہوگا۔ یہ اور ان جیسی تمام

---

(۱) [صحیح بخاری (ج۱/ص۲۰، نمبر: ۵۳)]۔
(۲) [صحیح بخاری (ج۱/ص۳۳ نمبر: ۱۰۵)]۔
(۳) [سنن ابو داؤد (ج۳/ص۳۲۱، نمبر: ۳۶۵۹)]۔ شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔

احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ: حدیث کو یاد کرنے، سننے سنانے اور اس کی تبلیغ واشاعت کرنے کا حکم خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا، بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث کی حفاظت کرنے والوں کیلئے دعائیں کی ہیں: ((نضَّر الله امرأً سَمِع مقالتي فوَعَاها وحَفِظها وبَلَّغها..))۔ [1] اللہ رب العالمین اس کے چہرے کو تر و تازہ اور خوش رکھے جس نے میری احادیث کو سن کر یاد کیا اور پھر اس کی تبلیغ واشاعت میں لگ گیا..

پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس چیز کی حفاظت پر دعائیں دے رہے ہوں وہ چیز ضائع و برباد ہو جائے؟ لیکن منکرین احادیث کو یہ بات ہضم ہی نہیں ہوتی۔

منکرین حدیث کا ایک تناقض ملاحظہ فرمائیں: ان کے دعوی کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے احادیث جلاڈالی تھیں تو پھر سوال یہ ہے کہ:

جب احادیث جلادی گئی تھیں تو وہ احادیث کیسے بچ گئیں جن کو یہ منکرین سنت احادیث کو جلانے کی دلیل بنا کر پیش کرتے ہیں؟ مطلب ساری احادیث کو جلانے کا حکم مل گیا لیکن جو احادیث منکرین حدیث کی تائید میں تھیں ان کو اس سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا!!؟؟

جن واقعات و اقوال سے منکرین سنت استدلال کر رہے ہیں کسی نہ کسی محدث نے اپنی کتاب میں انہیں ضرور نقل کیا ہو گا، جب ان محدثین کے نقل کردہ یہ اقوال منکرین سنت کے نزدیک حجت ہو سکتے ہیں تو پھر انہی محدثین کی جمع کردہ احادیث کیوں کر حجت نہیں ہو سکتی؟

عجیب تناقض ہے، یہی محدثین جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث نقل کرتے ہیں تو منکرین سنت کی پیشانی پر بل پڑ جاتے ہیں، محدثین کے خلاف تہمت تراشنے لگ جاتے ہیں، ان کی ثقاہت وعدالت کو مشکوک بناتے ہیں اور ان کی دیانت وامانت پر انگشت نمائی کرتے ہیں، اور جب انہی محدثین کی جمع کردہ بعض احادیث و آثار میں ان منکرین سنت کی ہوائے نفس کے موافق کوئی بات ہوتی ہے تو فورا اسے اپنے لئے دلیل بنا لیتے ہیں، حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ منکرین سنت اپنے موقف پر صرف اور صرف قرآن سے دلیل پیش کرتے یا پھر صرف ان احادیث و آثار کی کتابوں سے دلیل پیش کرتے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یا صحابہ کرام کے زمانہ میں کسی کتاب میں لکھی گئی ہوں، یا ان کتاب میں لکھی گئی ہوں جنہیں جلایا نہیں گیا ہو۔

در حقیقت منکرین سنت عوام کو یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے، ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے احادیث کو جلا دیا تھا تو احادیث باقی نہیں رہی، بنابریں احادیث کی جو کتابیں پائی جاتی ہیں یہ سب بیکار اور من گھڑت ہیں۔

---

(۱)[سنن ترمذی (ج۵/ص ۳۴، نمبر: ۲۶۵۸)]۔

قارئین کرام: منکرین سنت کی تدلیس و تلبیس اور خواہشات نفسانی کی پیروی کو جان لینے کے بعد ہم ان کے اعتراض کی حقیقت سے بھی پردہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ کیا حقیقت میں معاملہ ویسا ہی جیسا منکرین سنت نے دعویٰ کیا ہے!!!

احادیث کے صحیفوں کے جلانے کی بابت تین روایات وارد ہوئی ہیں، ذیل میں ہم ان کا تفصیلی جائزہ آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں:

پہلی روایت: ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو فرماتے ہم اسے لکھ لیتے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: تم لوگ کیا لکھ رہے ہو؟ ہم نے کہا: جو ہم آپ سے سنتے ہیں لکھ لیتے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قرآن مجید کے سوا کچھ نہ لکھا کرو، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم نے جو کچھ لکھا تھا اسے ایک جگہ جمع کیا اور جلا ڈالا، پھر ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: اے اللہ کے رسول ہم آپ کی حدیث لکھ نہیں سکتے لیکن کیا ہم ان احادیث کو بیان کر سکتے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں بالکل، بلا تردد میری حدیثیں بیان کرو...

اس حدیث کو امام احمد رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں ذکر کیا ہے۔[۱] اس کی سند عبد الرحمن بن زید بن اسلم کی وجہ سے ضعیف ہے۔ امام احمد، ابن معین، علی بن المدینی، ابو حاتم، ابو زرعہ اور امام نسائی رحمہم اللہ وغیرہم نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔[۲] نیز حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو منکر کہا ہے۔[۳]

قارئین کرام: یہ حدیث منکرین سنت کیلئے حجت نہیں بن سکتی کیوں کہ جب وہ سنت کو مانتے ہی نہیں تو پھر اس سے استدلال کیسے کرتے ہیں؟

دوسری بات: یہ حدیث محدثین کے نزدیک ضعیف ہے، یعنی خود محدثین اس حدیث کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں مانتے تو پھر منکرین سنت جو صحیح احادیث کو بھی نہیں مانتے وہ اس ضعیف اور غیر ثابت شدہ حدیث کو اپنے موقف کی تائید میں کیسے پیش کر رہے ہیں؟

تیسری بات: بفرض محال اس حدیث کو صحیح مان بھی لیا جائے پھر بھی منکرین سنت کا استدلال اس حدیث سے غلط ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف احادیث لکھنے سے منع کیا تھا، بیان کرنے سے نہیں، جیسا کہ مذکورہ بالا حدیث سے بالکل واضح ہے۔

---

(۱)[ج ۱۷/ص ۱۵۶، نمبر: ۱۱۰۹۲]۔

(۲)[الکامل فی ضعفاء الرجال (ج ۵/ص ۴۴۲)، الجرح والتعدیل (ج ۵/ص ۲۳۳)]۔

(۳)[میزان الاعتدال (ج ۲/ص ۵۶۵)]۔

چوتھی بات: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدائی دور میں احادیث لکھنے سے منع کیا تھا تاکہ قرآنی آیات اور احادیث کے مابین اس طور پر اختلاط نہ ہو جائے کہ آیات و احادیث کے مابین تمیز نہ ہو سکے، جب اختلاط اور عدم تمیز کا خوف زائل ہو گیا، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منع کرنے کے مقصد کو سمجھ گئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھنے کی اجازت دے دی، چنانچہ عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات کو لکھ لیا کرتا تھا، قریش کے بعض لوگوں نے مجھے اس سے منع کیا، میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: اللہ کی قسم میرے منہ سے صرف حق نکلتا ہے اس لئے اسے لکھ لیا کرو۔

اسی طرح حجۃ الوداع کے موقع پر ابو شاہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کیا کہ حجۃ الوداع کا خطبہ انہیں تحریری شکل میں دیا جائے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کرام کو حکم دیا کہ وہ خطبہ تحریر کر کے ابو شاہ رضی اللہ عنہ کو دے دیں۔

مختصر یہ کہ حدیثوں کو جلانے والی روایت ضعیف ہے، اور اگر اسے صحیح مان بھی لیا جائے تو اس حدیث سے صرف احادیث لکھنے کی ممانعت ثابت ہوتی ہے، حدیث بیان کرنے کی ممانعت نہیں، نیز یہ ممانعت بعض اسباب کی بنیاد پر شروع کے ادوار میں تھی، بعد میں جب اسباب زائل ہو گئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھنے کی اجازت دے دی بلکہ اس کا حکم بھی دیا، جیسا کہ اس سلسلے میں متعدد صحیح احادیث وارد ہیں، مختصر یہ کہ منکرین سنت جب ضعیف حدیث سے اپنے غلط موقف پر استدلال کر سکتے ہیں تو پھر صحیح احادیث کی بنیاد پر اپنے اس غلط موقف سے رجوع کیوں نہیں کر سکتے؟ یا پھر انہیں عدل و انصاف اور بحث و تحقیق سے کوئی سروکار ہی نہیں، خواہش نفس کے پیروکار ہیں؟

دوسری روایت: ابو بکر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے احادیث کے ایک مجموعہ کو جس میں ۵۰۰ حدیثیں تھیں اسے جلا دیا تھا۔

روایت کا حکم: امام ذہبی نے کہا کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے [۱]، اور امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس کی سند میں علی بن صالح نام کا ایک مجہول راوی ہے، نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی احادیث کی تعداد اس سے ہزاروں گنا زیادہ ہے۔ [۲]

اس کے برعکس ابو بکر رضی اللہ عنہ نبی کی تمام حدیث پر عمل کرتے تھے، بلکہ ایک سنت کو چھوڑنا گمراہی تصور کرتے تھے، ذیل میں ان کے اقوال ملاحظہ فرمائیں:

---

(۱)[تذکرۃ الحفاظ (ج۱/ص۱۰)]۔

(۲)[کنز العمال (ج۱۰/ص۲۸۶)]۔

ا- فرماتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال میں سے ایک چیز کو بھی چھوڑنا مجھے گوارہ نہیں، کیوں کہ مجھے ڈر ہے کہ اگر میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سنت کو بھی چھوڑ دیا تو گمراہ ہو جاؤں گا۔ (۱)

ب- دادی کی میراث کے سلسلے میں ابو بکر رضی اللہ عنہ کو حدیث نہیں معلوم تھی، جب مغیرہ بن شعبہ اور محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہما نے نبی کی حدیث بتائی تو اس کے مطابق فیصلہ کیا۔ (۲)

ج- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب خلافت کے سلسلے میں نزاع ہوا تو اس کا حل ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حدیث سے پیش کیا اور فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ((الأئمة من قريش)). (۳)

ھ- ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جب انس رضی اللہ عنہ کو بحرین کا والی بنا کر بھیجا تو زکاۃ وصدقات کی احادیث لکھ کر ان کے حوالہ کیا۔ (۴)

و- جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دفن کے سلسلے میں اختلاف ہوا کہ آپ کو دفن کہاں کیا جائے؟ اس کا حل بھی ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حدیث سے پیش کیا اور کہا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے: انبیائے کرام کی جس جگہ وفات ہوتی ہے انہیں وہیں دفن کیا جاتا ہے، اس حدیث کے پیش نظر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں دفن کیا گیا، کیونکہ آپ کی وفات وہیں ہوئی تھی۔ (۵)

خلاصہ کلام یہ کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنی زندگی کا ہر کام حدیث کے مطابق کرتے تھے، اور ایک حدیث کو بھی چھوڑنا گمراہی تصور کرتے تھے، حدیث کے مطابق فیصلے کرتے، احادیث لکھ کر دوسروں کو بھیجا کرتے، کسی مسئلے میں اختلاف ہو جاتا تو اس کا حل بھی حدیث سے پیش کرتے تھے، لہذا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ کثرتِ روایت سے منع کرتے تھے یا انہوں نے احادیث کے مجموعے کو جلا دیا تھا درست نہیں، بلکہ احادیث کی حفاظت اور اس پر عمل کرنے اور اس کی نشر واشاعت کرنے میں ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پیش پیش رہتے۔

تیسری روایت: امیر المؤمنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے اپنے زمانے میں بعض کتابوں کو جلا دیا تھا، لیکن یہ روایت بھی ضعیف ہے، کیونکہ اس روایت کو القاسم بن محمد نے عمر رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے، اور

---

(۱)[صحیح بخاری (ج ۴/ص ۹۷ نمبر: ۳۰۹۳)]۔

(۲)[سنن ابوداود (ج ۴/ص ۵۲۱، نمبر: ۲۸۹۴)]۔

(۳)[أحکام القرآن (ج ۲/ص ۴۱۶)]۔

(۴)[صحیح بخاری (ج ۹/ص ۲۳ نمبر: ۶۹۵۵)]۔

(۵)[مسند أحمد (ج ۱/ص ۲۰۷، نمبر: ۲۷)]۔

قاسم کی ولادت عمر رضی اللہ کی وفات کے تقریباً تیرہ سال بعد علی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ہوئی ہے۔[۱] چنانچہ یہ اثر منقطع ہے، اور منقطع ضعیف ہوتا ہے۔

جب کہ اس کے برخلاف عمر رضی اللہ عنہ احادیث رسول کی تعظیم اور اس کی نشر و اشاعت کا اہتمام کرتے تھے، اور اس بات کے حریص تھے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ احادیث رسول کی تعلیم حاصل کریں، ہم آپ کی خدمت میں عمر رضی اللہ عنہ کے چند آثار و اقوال پیش کرتے ہیں جن سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکیں گے کہ عمر رضی اللہ عنہ کو احادیث رسول ﷺ سے کس قدر والہانہ محبت تھی، اور ہر معاملہ اور حکم و فیصلے میں سنت کو مقدم رکھتے تھے:

۱- عمر رضی اللہ عنہ نے قرآن کی طرح احادیث جمع کرنے کے سلسلے میں صحابہ کرام سے مشورہ کیا تھا، اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے اس قدم کو مستحسن سمجھا تھا، لیکن عمر رضی اللہ عنہ نے اس ارادہ کو ترک کر دیا اور کہا: کہ میں نے تم لوگوں سے حدیث جمع کرنے کا مشورہ کیا تھا لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ یہود و نصاری نے اللہ کی نازل کردہ تورات و انجیل کے ساتھ اور بھی کتابیں لکھی، اور نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ کتاب اللہ کو چھوڑ کر ان کتابوں پر توجہ دینے لگے جو انہوں نے خود لکھا تھا۔[۲]

اس روایت کو عروہ بن الزبیر نے عمر رضی اللہ سے نقل کیا ہے، اور عروۃ کی لقاء عمر رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں،[۳] چنانچہ یہ سند منقطع ہوئی۔

خطیب بغدادی نے سفیان ثوری کے واسطے سے ایک متصل سند نقل کی ہے جس میں عروۃ نے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے واسطے سے عمر رضی اللہ سے حدیث بیان کی ہے، لیکن یہ سند ضعیف ہے، کیونکہ سفیان ثوری سے صرف فریابی نے متصل ذکر کیا ہے، بقیہ رواۃ نے فریابی کی مخالفت کی ہے اور اسے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بغیر منقطع ذکر کیا ہے۔

نیز اس حدیث کی سند میں ابو الفتح عبد الملک ہیں جو خطیب کے شیخ ہیں، ان کے بارے میں خطیب نے: لم یکن فی الحدیث بذاک، کہا ہے، اور یہ مراتب جرح میں سے ہے۔[۴]

خلاصہ کلام یہ کہ یہ اثر بھی ضعیف ہے، اگر ہم اسے حسن یا صحیح مان بھی لیتے ہیں تو اس اثر سے احادیث رسول کو لکھنے، ایک جگہ جمع کرنے اور اس کی نشر و اشاعت کی ہی ترغیب ملتی ہے، اس اثر جو باتیں سمجھ میں آتی ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱- عمر رضی اللہ عنہ احادیث کو قرآن کی طرح لکھنا چاہتے تھے۔

---

(۱)[سیر اعلام النبلاء (ج۵/ص۵۴)]۔

(۲)[مصنف عبد الرزاق (ج۱۱/ص۲۵۷، نمبر: ۲۰۴۸۴)، "المدخل الی السنن الکبری" (ص۴۰۷)، "تقیید العلم" (ص۴۹)]۔

(۳)[المراسیل لابن ابی حاتم (ص۱۴۹)]۔

(۴)[تاریخ بغداد (ج۱۲/ص۱۹۰)، تقیید العلم (ص۴۹)]۔

ب-ان کی اس رائے پر صحابہ کرام نے اتفاق بھی کر لیا۔

ج-عمر رضی اللہ عنہ نے جس خدشہ کے پیش نظر اس ارادہ کو ترک کیا تھا اسے ذاتی اجتہاد کہا جاسکتا ہے، کیونکہ:

-عمر رضی اللہ عنہ نے جب لکھنے کا ارادہ کیا تو تمام صحابہ کرام سے مشورہ لیا، اور جب ترک کرنے کا ارادہ کیا تو صرف اپنی رائے کا اظہار کیا۔

-دیگر صحابہ کرام سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ: جس خوف سے میں احادیث نہیں لکھ رہا ہوں تم لوگ بھی اسی خوف سے احادیث کو مت لکھنا۔

-جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے پاس احادیث لکھی ہوئی صورت میں موجود تھیں انہیں بھی اس سے نہیں روکا، اور نہ ہی کتابت حدیث پر پابندی لگائی۔

ج-خود عمر رضی اللہ عنہ حدیث کو یاد کرنے اور اسے روایت کرنے کے اتنے حریص تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہونے کیلئے ایک صحابی کے ساتھ اتفاق کیا ہوا تھا کہ ایک دن وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جائیں گے اور ایک دن میں جاؤں گا۔[۱]

د-خود عمر رضی اللہ عنہ سے پانچ سو سے زائد روایات موجود ہیں۔

ھ-عمر رضی اللہ عنہ بذات خود احادیث لکھ کر بعض لوگوں کو بھیجا کرتے تھے۔[۲]

و-ان کی عہد حکومت میں احادیث سے فیصلے ہوتے رہے۔

ز-بلکہ عمر رضی اللہ عنہ فرمایا: کچھ لوگ ایسے پیدا ہوں گے جو قرآن کی متشابہ آیات کا سہارا لے کر تم سے بحث وجدال کریں گے، تم ان کا مقابلہ سنن نبویہ کے ذریعہ کرنا، کیونکہ سنت رسول کا علم رکھنے والے کتاب اللہ کے بارے میں زیادہ جانتے ہیں۔[۳]

ح-عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: «مَن سَمِعَ حَدِيثًا، فَأدّاهُ كما سَمِعَ فَقَدْ سَلِمَ». جس شخص نے حدیث کو سنا اور اسے دوسروں تک ویسے ہی پہنچا دیا جیسے اس نے سنا تھا تو وہ محفوظ ہو گیا۔[۴]

ط-نیز عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: «تَعَلَّمُوا الفَرائِضَ والسُّنَّةَ كما تَتَعَلَّمُونَ القُرْآنَ». علم فرائض اور سنت کا علم اسی طرح حاصل کرو جس طرح قرآن مجید کا علم حاصل کرتے ہو۔[۱]

---

(۱)[صحیح مسلم (ج۲/ص۱۱۱۱، نمبر:۱۴۷۹)]۔

(۲)[صحیح بخاری (ج۷/ص۱۴۹، نمبر:۵۸۳۰)]۔

(۳)[سنن الدارمی (ج۱/ص۲۴۰، نمبر:۱۲۱)]۔

(۴)[المحدث الفاصل (ص۵۳۸)، جامع بیان العلم (ج۲/ص۱۰۰۸)]۔

ی- بلکہ عمر رضی اللہ عنہ اپنے گورنروں کو یہ ہدایت دیا کرتے تھے کہ لوگوں کو سنت، علم فرائض اور عربی زبان سیکھنے کی ترغیب دیں۔ (۲)

ک- خطیب بغدادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر کوئی یہ کہے کہ: عمر رضی اللہ عنہ کی کثرت روایت پر نکیر اور سختی کی آخر وجہ کیا تھی؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ: عمر رضی اللہ عنہ نے ایسا دین کے سلسلے میں احتیاط اور دور اندیشی کی بنیاد پر کیا، کیونکہ بعض احادیث ایسی ہیں جن کا ظاہری معنی مقصود نہیں ہوتا، اس لئے عمر رضی اللہ عنہ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ اس کے ظاہری معنی پر عمل نہ کرنے لگیں، نیز ضروری نہیں کہ ہر حدیث سننے یا سنانے والا حدیث کے مسائل سے واقف بھی ہو، بسا اوقات کوئی حدیث مجمل اور مختصر ہوتی ہے، اس کی تفسیر و توضیح اسی سلسلے میں وارد دوسری احادیث سے ہوتی ہے۔ (۳)

معلوم یہ ہوا کہ عمر رضی اللہ عنہ بغرض احتیاط کثرت سے روایت کرنے والے پر نکیر کرتے، یا کم سے کم روایت بیان کرنے کی تلقین کرتے، تاکہ سنت کی حفاظت اور اس کی نشر و اشاعت کما حقہ ہو سکے، کسی کو سنت کے نام پر کچھ اور پھیلانے کا موقع نہ مل سکے۔

ل- رہی بات کثرت روایت کی تو عمر رضی اللہ عنہ خود ان صحابہ کرام میں سے ہیں جو کثرت سے احادیث بیان کرتے تھے، ان کی مرویات کی تعداد ۵۰۰ سے متجاوز ہے، صرف دس سے زائد صحابہ کرام ہیں جنہوں نے عمر رضی اللہ عنہ سے زیادہ روایت بیان کی ہیں۔ (۴)

م- نیز انہوں نے خود اپنے زمانے میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو کھلے عام احادیث بیان کرنے کی اجازت دی۔ (۵)

خلاصہ کلام یہ کہ:

۱- حدیث کے شرعی حجت ہونے میں کبھی کسی کا اختلاف نہیں رہا، اس کی حجیت پر سب کا اجماع ہے۔

---

(۱)[جامع بیان العلم (ج۱/ص۷۸۰)]۔

(۲)[جامع بیان العلم (ج۲/ص۱۰۰۹)]۔

(۳)[شرف اصحاب الحدیث (ص۸۸)]۔

(۴)(الإحکام فی أصول الاحکام ۱۴۰/۲)۔

(۵)(سیر اعلام النبلاء ۶۰۳/۲)۔

۲- حدیث کو یاد کرنے، زبانی بیان کرنے، اس کی نشر و اشاعت کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے سے نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو روکا، نہ خلفائے راشدین میں سے کسی نے روکا اور نہ ہی بعد کے ادوار میں کسی نے روکا، بالإجماع یہ کام چلتا رہا اور آج تک چل رہا ہے۔

۳- مجموعہ احادیث کو نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جلانے کا حکم دیا، اور نہ ہی خلفائے راشدین میں سے کسی نے، بلکہ اس کے برعکس نبی کریم صلی اللہ علیہ اور ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما احادیث لکھنے کی ترغیب دیتے۔

۴- کثرت حدیث کی ممانعت بھی کسی سے ثابت نہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا ہر چھوٹے بڑے معاملے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب رجوع کرنا بھی کثرت احادیث پر دلالت کرتا ہے، نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کثرت سے روایت بیان کرتے تھے، کسی نے ان کو نہیں روکا، بلکہ عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں انہیں احادیث بیان کرنے کی اجازت دی۔

آیت "وَمن لم يحكم بِمَا أنزل الله فَأُولَئِك هم الْكَافِرُونَ" کا صحیح معنی ومفہوم، اور غور وفکر کے چند زاویے (قسط اول)

فاروق عبد اللہ نراین پوری
جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ

اہل سنت والجماعت کے متعدد اصولوں میں سے ایک اہم اصول یہ ہے کہ کتاب وسنت کے نصوص کو سلف صالحین کے فہم کے مطابق سمجھا جائے، فہم سلف کو پس پشت ڈال کر ان کی من مانی تفسیر نہ کی جائے۔ کتاب وسنت کے بہت سارے نصوص ایسے ہیں جن کا مفہوم سلف صالحین نے کچھ بیان کیا ہے، اور اہل بدعت نے کچھ۔ اہل بدعت انھیں دوسرے معنی ومفہوم پر محمول کرتے ہیں، اور ان پر اپنے باطل عقائد ونظریات کی بنیاد رکھتے ہیں۔ انہی میں سے ایک نص قرآن کریم کی یہ آیت ہے: ''وَمن لم يحكم بِمَا أنزل الله فَأُولَئِك هم الْكَافِرُونَ''[۱]۔

اس کی تفسیر سلف صالحین کے یہاں معروف ہے کہ یہ آیت قانون الٰہی چھوڑ کر بشری قانون نافذ کرنے والے کی تکفیر کے بارے میں عام نہیں، بلکہ اس میں تفصیل ہے (جس کا بیان آگے آرہا ہے)۔

استاد محترم شیخ سلیمان الرحیلی حفظہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت قانون الٰہی چھوڑ کر بشری قانون نافذ کرنے والے کی تکفیر کے بارے مطلق نہیں ہے، اہل سنت والجماعت کا اس بارے میں اجماع ہے کہ یہاں اس آیت کا ظاہری معنی مراد نہیں اور یہاں کفر سے مراد وہ کفر نہیں جو انسان کو دائرہ اسلام سے خارج کر دے، صرف خوارج نے اس مفہوم سے اختلاف کیا ہے[۲]۔

بلکہ اس آیت اور اس معنی کی دوسری آیتوں کو بنیاد بنا کر ہی اس باطل فرقے کا وجود ہوا ہے، امام لالکائی اس فرقے کے ظہور کی تاریخ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"قالوا: ﴿إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ﴾، ﴿وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ﴾، فأنت لم تحكم بما أنزل الله، ولم تحتكم إلى ما أنزل الله، وإنما احتكمت إلى الرجال، فخرجوا على علي بن أبي طالب وانشقوا عنه بعد أن كانوا معه، فسموا حينئذ بالخوارج[۳].

---

(۱) سورۃ المائدہ (۴۴)۔

(۲) الاصول السنیہ البہیہ فی کشف شبہ اہل الفتن الغویہ (ص ۲۲۳)، والافادۃ والاعلام بفوائد رسالۃ نواقض الاسلام (ص ۷۰) کلاہما لسلیمان الرحیلی۔

(۳) شرح اصول اعتقاد اہل السنہ والجماعہ (۴/۳)۔

(خوارج نے کہا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "فیصلہ صرف اور صرف اللہ کا ہو گا" اور "جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ کافر ہیں"، اور آپ نے اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کیا، اور نہ اللہ کے نازل کردہ قانون کو اپنا فیصل قرار دیا، بلکہ لوگوں کو اپنا فیصل چنا، اس طرح انھوں نے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ پر خروج کیا، اور ان سے علیحدہ ہو گئے حالانکہ پہلے ان کے ساتھ ہی تھے، اس طرح اس وقت ان کا نام خوارج پڑ گیا۔)

مرتکب کبیرہ کے بارے میں خوارج اور معتزلہ کا منہج معروف و مشہور ہے کہ وہ اسے دائرہ اسلام سے خارج گردانتے ہیں۔ انھوں نے مذکورہ آیت اور دیگر نصوصِ وعید سے استدلال کرتے ہوئے اپنا یہ عقیدہ و منہج اختیار کیا ہے۔

علامہ ابن عبد البر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

قد ضلت جماعة من أهل البدع من الخوارج والمعتزلة في هذا الباب فاحتجوا بهذه الآثار ومثلها في تكفير المذنبين واحتجوا من كتاب الله بآيات ليست على ظاهرها، مثل قوله عز وجل: ﴿ومن لم يحكم بما أنزل الله فأولئك هم الكافرون﴾[1].

(اہل بدعت میں سے خوارج و معتزلہ کی جماعت اس باب میں گمراہ ہو گئی، انھوں نے گنہگار لوگوں کی تکفیر کے لئے انہی جیسے آثار سے دلیل پکڑی، اور قرآن کریم کی ایسی آیتوں کو بطور دلیل گردانا، جن کا ظاہری معنی مراد نہیں، مثلا اللہ تعالی کا یہ قول: "جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ کافر ہیں"۔)

یہ آیت خوارج و معتزلہ کی بہت بڑی دلیل ہے کہ قانون الہی چھوڑ کر بشری قانون نافذ کرنے والا دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ خوارج اسے صراحتا کافر کہتے ہیں، جب کہ معتزلہ کافر تو نہیں کہتے، لیکن دائرہ اسلام سے اسے خارج ضرور مانتے ہیں، اور اس کا مقام اسلام و کفر کے مابین قرار دیتے ہیں، جسے وہ "منزلۃ بین المنزلتین" سے تعبیر کرتے ہیں۔

صرف زمانہ قدیم ہی میں نہیں بلکہ آج بھی مسلم حکمرانوں کی تکفیر اور ان کے خلاف عَلَمِ بغاوت بلند کرنے کے لئے خوارج کی یہ ایک بہت بڑی دلیل رہی ہے۔

علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "اس زمانے میں، بلکہ کئی زمانے سے فتنہ تکفیر کی بنیاد یہی آیت رہی ہے، جس کے ارد گرد وہ گھومتے ہیں، اور بلا فہم و معرفت اس سے استدلال کرتے ہیں"[2]۔

چنانچہ قانون الہی کی جگہ بشری قانون کی تنفیذ کو وہ کفر اکبر ہی سمجھتے ہیں، اور اس قانون کے نافذ کرنے والوں بلکہ قبول کرنے والوں کو بھی کافر تسلیم کرتے ہیں۔

---

(۱) التمہید لابن عبد البر (۱۶/۱۷)۔

(۲) فتنۃ التکفیر (ص ۲۱)۔

خوارجِ عصر "اخوانیوں" کی فکر بھی یہی ہے، بلکہ ان کے بعض بڑے لیڈران اس معاملے میں قدیم خوارج سے بھی دو قدم آگے نظر آتے ہیں، وہ "حکم بغیر ما انزل اللہ" کی وجہ سے صرف حکمرانوں کو ہی کافر نہیں کہتے بلکہ پوری سوسائٹی کو مرتد، کافر اور جاہلی قرار دیتے ہیں۔ آپ اخوانیوں کے بہت بڑے پیشوا سید قطب کی کتابیں اٹھائیں یہ چیز جابہ جا نظر آئے گی۔ چنانچہ "فی ظلال القرآن" (۲/۱۰۵۷) میں فرماتے ہیں: "البشرية بجملتها، بما فيها أولئك الذين يرددون على المآذن في مشارق الأرض ومغاربها كلمات: لا إله إلا الله، بلا مدلول ولا واقع ... وهؤلاء أثقل إثمًا، وأشد عذابًا يوم القيامة؛ لأنهم ارتدوا إلى عبادة العباد من بعد ما تبين لهم الهدى، ومن بعد أن كانوا في دين الله".

(پوری انسانیت جس میں وہ بھی شامل ہیں جو مشرق و مغرب کی میناروں سے بلا فہم و بصیرت لا الہ الا اللہ کی صدا بلند کرتے ہیں... ایسے لوگوں کا گناہ زیادہ سنگین ہے، اور یہ قیامت کے دن سب سے سخت عذاب سے بھی دوچار ہونے والے ہیں، کیونکہ یہ حق واضح ہونے کے بعد مرتد ہو کر بندوں کی عبادت کی طرف پلٹ آئے، حالانکہ یہ پہلے دین الہی کے پیروکار تھے۔)

اور (۴/۲۱۲۲) میں فرماتے ہیں: "إنه ليس على وجه الأرض اليوم دولة مسلمة ولا مجتمع مسلم قاعدة التعامل فيه هي شريعة الله والفقه الإسلامي"۔ (آج روئے زمین پر کوئی ایسا مسلم ملک یا معاشرہ نہیں جہاں کا سماجی نظم ونسق اللہ کی شریعت اور فقہ اسلامی کے مطابق ہو۔)

سید قطب کی ان دونوں عبارتوں سے واضح ہے کہ وہ محض حکمرانوں کو ہی کافر نہیں سمجھتے بلکہ پوری دنیا کے لوگوں کو مرتد اور زمانہ جاہلیت کا پیروکار سمجھتے ہیں۔ واللہ المستعان۔

خود ڈاکٹر یوسف قرضاوی اپنے مرشد سید قطب کے بارے لکھتے ہیں کہ: "الحقيقة في نظر سيد قطب أن كل المجتمعات القائمة في الأرض أصبحت مجتمعات جاهلية، تكوَّن هذا الفكر الثوري الرافض لكل من حوله وما حوله، والذي ينضح بتكفير المجتمع، وتكفير الناس عامة؛ لأنهم "أسقطوا حاكمية الله تعالى" ورضوا بغيره حكمًا، واحتكموا إلى أنظمة بشرية، وقوانين وضعية... تكوَّن هذا الفكر الثوري الرافض، داخل السجن... الخ"[1].

(درحقیقت سید قطب کی نظر میں دنیا میں موجود تمام معاشرے جاہلی بن چکے ہیں۔ ان کی یہ انقلابی فکر جو ہر ایک سے الگ تھلگ اور کٹ کر رہنے پر ابھارتی ہے، جس کے نتیجے میں معاشرے کی تکفیر بلکہ تمام لوگوں کی عمومی تکفیر سامنے آتی ہے، کیونکہ انھوں نے "اللہ تعالی کی حاکمیت" کو ساقط کیا، غیر اللہ کو اپنا حَکَم بنانے پر راضی ہوے، اور وضعی قانون کو اپنا فیصل تسلیم کیا۔۔ ان کی یہ انقلابی اور برطرف رہنے کی فکر جیل میں رہنے کے دوران پروان چڑھی۔)

سید قطب کی کتاب "معالم فی الطریق" اور "فی ظلال القرآن" میں پوری انسانیت کی ایسی عمومی تکفیر کئی جگہوں پر موجود ہے، بلکہ حکمران اور مسلم ممالک سمیت پوری امت کی تکفیر انہوں نے کی ہے، کیونکہ انھوں نے قانون الہی کے بجائے

---

(۱) فی وَداع الاعلام لیوسف القرضاوی (ص ۹۷)۔

وضعی قانون کا نفاذ کیا، اور عوام بھی اپنے مسائل کے حل کے لیے انھی قوانین کی طرف رجوع کرتی ہے۔ یہاں تک کہ ان کے بعض کے ہاں امت کے کبار سلفی علما مثلا شیخ صالح الفوزان، شیخ عبد السلام السحیمی، شیخ سلیمان الرحیلی وغیرہم مرتد بلکہ حقیقی کفار ہیں۔

اخوانی فکر کی خباثت سے عدمِ واقفیت اور منہجِ سلف سے دوری کی بناپر بہت سارے سادہ لوح انسان ان کے دامِ فریب میں پھنس جاتے ہیں، اور ان کے آلہ کار بن کر فتنہ وفساد پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں

شیخ سلیمان الرحیلی حفظہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان کے افکار سے متاثر ایک شخص نے مجھے اور شیخ عبد السلام السحیمی حفظہ اللہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آپ لوگ مرتد نہیں بلکہ حقیقی کافر ہیں، کیونکہ آپ نے اللہ تعالی کو پہچانا ہی نہیں کہ آپ کے مرتد ہونے کی نوبت آئے[1]۔ اناللہ وانا الیہ راجعون، فہم سلف کو چھوڑ کر کوئی نصوص شریعت کی من مانی تفسیر کرے تو اس کا نتیجہ کتنا خطرناک ہو سکتا ہے اس سے بہ آسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

زمانہ قدیم سے خوارج نے اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے مسلم حکمرانوں کی تکفیر کی، اور ان کے خلاف خروج وبغاوت کو جائز ٹھہرایا۔ حالانکہ سلف صالحین کے یہاں اس آیت کے فہم میں کوئی اختلاف ہی نہیں کہ یہاں آیت اپنے ظاہری پیرائے میں نہیں، لہذا یہ حکمرانوں کی مطلق تکفیر پر دلالت نہیں کرتی، بلکہ اس میں تفصیل ہے۔

علامہ ابن ابی العز الحنفی رحمہ اللہ شرح العقیدۃ الطحاویہ[2] میں اس "تفصیل" پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

"أَنَّ الْحُكْمَ بِغَيْرِ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَدْ يَكُونُ كُفْرًا يَنْقُلُ عَنِ الْمِلَّةِ، وَقَدْ يَكُونُ مَعْصِيَةً: كَبِيرَةً أَوْ صَغِيرَةً، وَيَكُونُ كُفْرًا: إِمَّا مَجَازِيًّا، وَإِمَّا كُفْرًا أَصْغَرَ، عَلَى الْقَوْلَيْنِ الْمَذْكُورَيْنِ، وَذَلِكَ بِحَسَبِ حَالِ الْحَاكِمِ: فَإِنَّهُ إِنِ اعْتَقَدَ أَنَّ الْحُكْمَ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ غَيْرُ وَاجِبٍ، وَأَنَّهُ مُخَيَّرٌ فِيهِ، أَوِ اسْتَهَانَ بِهِ مَعَ تيقنه أنه حُكْمُ اللَّهِ: فَهَذَا كُفْرٌ أَكْبَر, وَإِنِ اعْتَقَدَ وُجُوبَ الْحُكْمِ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ، وَعَلِمَهُ فِي هَذِهِ الْوَاقِعَةِ، وَعَدَلَ عَنْهُ مَعَ اعْتِرَافِهِ بِأَنَّهُ مُسْتَحِقٌّ لِلْعُقُوبَةِ، فَهَذَا عَاصٍ، وَيُسَمَّى كَافِرًا كُفْرًا مَجَازِيًّا، أَوْ كُفْرًا أَصْغَرَ, وَإِنْ جَهِلَ حُكْمَ اللَّهِ فِيهَا، مَعَ بَذْلِ جُهْدِهِ وَاسْتِفْرَاغِ وُسْعِهِ فِي معرفة الحكم وأخطأه، فهذا مخطىء، لَهُ أَجْرٌ عَلَى اجْتِهَادِهِ، وَخَطَؤُهُ مَغْفُورٌ".

(اللہ تعالی کے نازل کردہ قانون کے علاوہ کسی دوسرے قانون کے مطابق فیصلہ کرنا بسا اوقات ایسا کفر ہوتا ہے جو دائرہ اسلام سے خارج کردے، جب کہ بسا اوقات وہ کبیرہ یا صغیرہ گناہوں کے زمرے میں آتا ہے، جب کہ اس پر بسا اوقات کفر کا اطلاق مجازًا ہوتا ہے، یا اس سے مراد کفر اصغر ہوتا ہے۔ حکمراں کے حالات کے حساب سے اس کا حکم بدلتا رہتا ہے۔ اگر وہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ کرنا واجب نہیں، یا یہ سمجھتا ہے کہ چاہے اس قانون کے مطابق فیصلہ کرے، چاہے نہ کرے اسے اختیار ہے، یا اس کی ناقدری اور استخفاف کرتا ہے، گرچہ اسے یقین ہو کہ یہ اللہ کا قانون ہے تو

---

(۱) الاصول السنیہ البہیہ فی کشف شبہ اہل الفتن الغویہ لسلیمان الرحیلی (ص ۴۰-۴۱)

(۲) (ص: ۳۲۴)۔

یہ کفر اکبر ہے۔ اور اگر یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ کرنا واجب ہے، نیز اس خاص واقعہ میں اسے اس قانون الٰہی کا علم بھی ہو، لیکن اس کے باوجود اس سے روگردانی کرے، اور اعتراف بھی ہو کہ وہ سزا کا مستحق ہے، تو وہ گنہگار ہے، اسے کفر مجازی یا کفر اصغر کا مرتکب سمجھا جائے گا۔ لیکن اگر اسے قانون الٰہی کا علم ہی نہ ہو، جانکاری حاصل کرنے کی حتی الامکان کوشش کے باوجود اس سے غلطی ہو جائے، تو اسے غلط فیصلہ کرنے کا مرتکب سمجھا جائے گا۔ اور اپنے اجتہادی غلطی پر وہ نیکی کا مستحق ٹھہرے گا، اور-ان شاء اللہ- یہ غلطی بخش دی جائے گی۔)

علامہ ابن ابی العز الحنفی رحمہ اللہ نے یہاں اس مسئلہ میں سلف صالحین کے تمام اقوال کا خلاصہ پیش کر دیا ہے۔ اگر اس آیت کی تفسیر میں صحابہ کرام، تابعین عظام، تبع تابعین اور ان کے بعد آنے والے اسلاف کرام کے اقوال جمع کئے جائیں تو یہی تفصیل سامنے آتی ہے۔

اہل بدعت کے ساتھ تعامل، منہج سلف، اکابر اہل حدیث کا طرز عمل، بعض اشکالات اور ان کا ازالہ

محمد ضیاء الحق تیمی

جامعہ اسلامیہ مدینہ نبویہ

بہت سارے اذہان میں یہ بات راسخ ہے کہ اہل بدعت کے ساتھ تعامل میں سلف کے منہج اور اکابر اہل حدیث کے منہج میں فرق پایا جاتا ہے، اور ہمارے اکابر اہل بدعت کے ساتھ ہر طرح کے تعامل کے روادار تھے، اور ہمارے ارد گرد کے ماحول کے اعتبار سے ہمارے لئے وہی منہج درست ہے جو ہمارے اکابر نے اختیار کیا ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ اہل بدعت کے تئیں سلف اور ہمارے اکابر کے موقف کو ایک ساتھ سمجھنے کی کوشش کی جائے اور دیکھا جائے کہ کیا واقعی ان دونوں کے درمیان کوئی ایسا جوہری اختلاف موجود ہے جو ہمیں دو مختلف محاذوں میں تقسیم کر دے؟ یا معاملہ صرف ہمارے سوئے فہم کا ہے؟

● **سب سے پہلا مسئلہ یہ ہے کہ** سلف یعنی صحابہ کرام، تابعین عظام، تبع تابعین، اور ائمہ کرام اور علمائے اہل سنت کا منہج اہل بدعت کے تعلق سے کیا تھا؟ نیچے اسی سلسلے میں اہل علم کے کچھ اقوال پیش کئے جا رہے ہیں:

(۱) امام صابونی اہل سنت کا منہج بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: (ويبغضون أهل البدع الذين أحدثوا في الدين ما ليس منه ، و لا يحبونهم ، ولا يصحبونهم). وہ اہل بدعت سے بغض رکھتے ہیں جنہوں نے دین میں بدعات ایجاد کیں، نہ ان سے محبت رکھتے ہیں اور نہ ہی ان کی صحبت اختیار کرتے ہیں۔[۱]

(۲) نیز فرمایا: (يحابّون في الدين، ويتباغضون فيه، ويتّقون الجدال في أصول الدين، والخصومات فيه، ويجانبون أهل البدع والضلالات، ويعادون أصحاب البدع والأهواء المرديات الفاضحات)۔ دین کی وجہ سے وہ کسی سے محبت یا بغض رکھتے ہیں، اصول دین میں بحث وجدال اور مناظرہ بازی سے بچتے ہیں، اہل بدعت وضلالت سے دوری بنائے رکھتے ہیں اور بدعتیوں اور ہوا پرستوں سے عداوت رکھتے ہیں۔[۲]

(۳) مزید فرماتے ہیں: "إحدى علامات أهل السنة حبهم لأئمة السنة، وعلمائها وأنصارها وأو لیائها، وبغضهم لأئمة البدع، الذين يدعون إلى النار، ويدلون أصحابهم على دار البوار، وقد زين الله سبحانه قلوب أهل السنة ونورها بحب علماء السنة فضلا منه جل جلاله". اہل سنت کی ایک علامت یہ ہے کہ وہ اہل سنت کے ائمہ، علماء،

---

(۱)[عقیدۃ السلف أصحاب الحدیث](ص:۳۴)۔

(۲)[عقیدۃ السلف أصحاب الحدیث](ص:۳۴)۔

انصار اور اولیاء سے محبت کرتے ہیں اور اہل بدعت کے ائمہ سے بغض رکھتے ہیں، جو لوگوں کو جہنم کی طرف دعوت دیتے ہیں اور اس کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، اور اللہ عزوجل کا ان پر یہ فضل واحسان ہے کہ وہ ان کے دلوں کو علمائے اہل سنت کی محبت سے پر نور اور مزین رکھتا ہے۔[۱]

(۴) ایک اور مقام پر فرماتے ہیں: "اتفقوا مع ذلك على القول بقهر أهل البدع، وإذلالهم وإخزائهم وابعادهم واقصائهم، والتباعد منهم ومن مصاحبتهم ومعاشرتهم، والتقرب إلى الله عز وجل بمجانبتهم ومهاجرتهم"۔ اہل بدعت کو زیر کرنے، ان کی تذلیل اور توہین کرنے، ان کو دور بھگانے، اور ان سے دوری بنانے، اور ان کی صحبت اور ہم نشینی سے بچنے، اور ان سے قطع تعلق کو تقرب الٰہی کا ذریعہ سمجھنے میں تمام اہل سنت کا اتفاق ہے۔[۲]

(۵) امام بغوی رحمہ اللہ (۵۱۶ھ) فرماتے ہیں: (و قد مضت الصحابة و التابعون ، و أتباعهم ، و علماء السنن على هذا مجمعين متفقين على معاداة أهل البدع و مهاجرتهم). یعنی صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین اور علمائے اہل سنت اس بات پر متفق ہیں اور اس پر اجماع قائم ہے کہ اہل بدعت سے عداوت رکھی جائے گی اور ان سے قطع تعلق کیا جائے گا۔[۳]

(۶) امام شاطبی رحمہ اللہ (۷۹۰ھ) فرماتے ہیں: (إن فرقة النجاة ، وهم أهل السنة ، مأمورون بعداوة أهل البدع ، والتشريد بهم ، والتنكيل بمن انحاش إلى جهتهم ، ونحن مأمورون بمعاداتهم ، وهم مأمورون بموالاتنا و الرجوع إلى الجماعة)۔ فرقہ ناجیہ اہل سنت کو حکم ہے کہ وہ اہل بدعت سے عداوت رکھیں، انہیں اپنے سماج سے بھگائیں، اور اگر وہ باہر سے آدھمکیں تو انہیں سخت سزائیں دیں، ہمیں ان سے عداوت رکھنے کا حکم ہے، جبکہ انہیں حکم ہے کہ وہ ہم سے دوستی کریں اور ہماری جماعت میں شامل ہو جائیں۔[۴]

ان اقوال کو بار بار پڑھیں اور ساتھ ہی اس نکتے پر غور کریں کہ ان میں جتنی بھی باتیں اہل بدعت کے حوالے سے کہی گئی ہیں وہ جمہور سلف یا بعض سلف کی رائے نہیں، بلکہ تمام اسلاف کرام صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ اہل سنت کی اجماعی رائے ہے، یعنی ان میں سے کسی بھی بات کو رد کرنا گویا سلف کے اجماعی موقف سے انحراف ہے۔

---

(۱) [عقیدۃ السلف أصحاب الحدیث] (ص:۳۷)۔

(۲) [عقیدۃ السلف أصحاب الحدیث] (ص:۳۹)۔

(۳) [شرح السنۃ للبغوی:۱/۲۲۷]۔

(۴) [الاعتصام للشاطبی:۱/۱۲۰]۔

● اب سوال یہ ہے کہ یہ اقوال تو انتہائی صریح، دوٹوک اور واضح ہیں، ان میں کوئی غموض اور اشکال بھی نہیں کہ سمجھنے میں کوئی دقت ہو، جبکہ ہمارے اکابر اہل حدیث کا طرز عمل بظاہر اس سے مختلف نظر آتا ہے، تو اس کے لئے ہمیں کئی پہلوؤں پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

سب سے پہلے تو ہم یہ حسن ظن رکھیں کہ ہمارے اکابر کا عمومی طرز عمل اسلاف کرام سے اس قدر مختلف نہیں رہا ہو گا، اور جو اختلاف ہمیں نظر آرہا ہے وہ ہمارے سوئے فہم کا نتیجہ ہے، اور اگر کہیں یقین ہو جائے کہ انہوں نے سلف کے منہج کو ترک کیا ہے تو چونکہ ہم پر سلف کے منہج کی پیروی ضروری ہے، نہ کہ اکابر کی، اور وہی نجات کی راہ ہے، اس لئے ہم سلف کے منہج کو پکڑتے ہوئے اپنے اکابر کے بظاہر مخالف طرز عمل کی بہتر سے بہتر توجیہ پیش کریں اور ان کے لئے اعذار تلاش کریں، نہ کہ انہیں سلف کے مقابلے میں لا کھڑا کریں، کیوں کہ ہمارے اکابر نے نہ ہی اس کی دعوت دی ہے اور نہ ہی یہ ان کا منہج ہے۔ گویا اکابر پرستی میں منہج سلف کو ترک کرنا منہج سلف سے بھی انحراف ہے اور اکابر کے منہج سے بھی انحراف ہے۔ کیوں کہ ہمارے اکابر کتاب وسنت اور فہم سلف کو ہر چیز پر مقدم رکھتے تھے۔ اور ایسی صورت میں ہم میں اور گمراہ فرقوں میں کوئی فرق بھی نہیں رہے گا جو اکابر پرستی میں غلو کرتے ہوئے کتاب وسنت اور منہج سلف سے دور ہوتے چلے گئے۔

اس مختصر تمہید کے بعد آگے ہم غور کرتے ہیں کہ کیا واقعی ہمارے اکابر نے اہل بدعت کے ساتھ تعامل کے باب میں اسلاف کرام کے منہج کو بالائے طاق رکھ دیا تھا جیسا کہ بعض حضرات اسلاف کے اس موقف کو سن کر غیظ وغضب کا شکار ہو جاتے اور انہیں بلا کسی دلیل وبرہان کے محض اکابر پرستی کے زعم میں رد کر دیتے ہیں:

● اسلاف کرام اور اکابر اہل حدیث کا منہج:

اوپر اہل بدعت کے ساتھ تعامل کے سلسلے میں اسلاف کرام صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ اسلام کا جو اجماعی منہج بیان کیا گیا ہے وہ چار اصول پر مبنی ہے:

۱- پہلا اصول: اہل بدعت سے بغض اور عداوت رکھنا۔

اس اصول کا تعلق مسئلہ عقیدہ ولاء وبراء سے ہے، یعنی کسی سے خالص اللہ کے لئے محبت کرنا اور اسی کے لئے بغض رکھنا، اور اس کا تقاضا ہے کہ ایک بدعتی سے بغض رکھا جائے کیونکہ وہ اللہ اور اس کے رسول کا دشمن ہوتا ہے، دین کا خائن وغدار ہوتا ہے، وہ اللہ کے دین میں تحریف پیدا کرنے اور اسے مسخ کرنے کی کوشش کرتا ہے، شریعت سازی میں وہ اپنے آپ کو اللہ کا شریک ٹھہراتا ہے، اور اللہ کے بندوں کو ضلالت وگمراہی اور جہنم کی راہ کی طرف بلاتا ہے، لہذا ہر مومن سے مطلوب ہے کہ وہ اہل بدعت سے اس کی بدعت کے بقدر بغض اور عداوت رکھے۔ اس میں کسی بھی قسم کا خلل در اصل ایمان اور عقیدے میں خلل ہے۔ اسی لئے بدعت اور اہل بدعت کی مذمت اور شناعت پر نصوص شریعت بھرے ہوئے ہیں اور اس میں کسی بھی قسم کی مداہنت جرم عظیم اور ایمان وعقیدے کے لئے خطرہ ہے۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان سے ویسے ہی بغض رکھا جائے گا جیسے کافروں اور منافقوں سے رکھا جاتا ہے، بلکہ ان کے ایمان کے بقدر ان سے دوستی اور محبت بھی رکھی جائے گی، اور بیک وقت ایک شخص سے اس کے ایمان کے بقدر محبت رکھنا اور فسق وبدعت کے بقدر دشمنی اور بغض رکھنا یہی اہل سنت کا عقیدہ ہے، اور اس میں وہ خوارج اور مرجئہ کے افراط اور تفریط کے درمیان ہیں۔ اس لئے ایک بدعتی شخص (جس کی بدعت مکفرہ نہ ہو) کے لئے استغفار اور اس پر ترحم کرنا، اس کے نماز جنازہ میں شریک ہونا جائز ہے، لیکن چونکہ وہ بدعتی بھی ہے اور لوگوں کو اس کی بدعت سے ڈرانا اور بچانا بھی ہے، اس لئے اہل علم وفضل کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایسا علانیہ نہ کریں تاکہ اس سے لوگ عبرت پکڑیں، بدعت کی شناعت وقباحت ان کے دل میں باقی رہے، اور ایک بدعتی سے جو نفرت اور بغض مطلوب ہے وہ خالص محبت میں نہ بدل جائے اور لوگ اس کے نقش قدم پر نہ چلنے لگیں۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے اکابر اہل حدیث اہل بدعت سے بغض نہیں رکھتے تھے، وہ ان سے خالص محبت کرتے تھے؟ اور وہ عقیدہ ولاء وبراء کے مفہوم سے ناآشنا تھے؟

حاشا وکلا! یقیناوہ اس باب میں سلف کے منہج پر تھے اور اس میں کسی کا بھی اختلاف یقینا نہیں ہونا چاہئے۔

۲- دوسرا اصول: اہل بدعت کی صحبت اختیار کرنے اور ہم نشینی سے بچنا۔ اس میں ان کے دروس اور محاضرات کو سننا، ان کی کتابیں پڑھنا وغیرہ بھی داخل ہیں۔

اہل بدعت کے ساتھ تعامل میں اہل سنت وجماعت کا یہ دوسرا متفقہ اصول ہے۔ یہ اصول در حقیقت عقیدہ ولاء وبراء، جو ایمان کا سب سے مضبوط کڑا ہے، کے ارد گرد ایک مضبوط دیوار کی طرح ہے، اسی عقیدہ ولاء وبراء کی حفاظت کے لئے صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ اسلام نے متفقہ طور پر اس دیوار کو پھلانگنے سے منع کیا ہے، جو ہم سے زیادہ دین کو سمجھنے والے، بدعات وخرافات کی باریکیوں سے واقفیت رکھنے والے، اور اپنی اصابت رائے، سلامت طبع، دور بینی، معاملہ فہمی، حکمت وبصیرت اور فہم وشعور میں اعلی وارفع تھے۔

اب جو شخص بھی اپنی ذہانت اور فقاہت پر اعتماد کرتے ہوئے سلف کے اس اصول سے انحراف کرتا ہے اور بدعت اور اہل بدعت سے قریب ہوتا ہے، اور اس دیوار کو پھلانگنے کی کوشش کرتا ہے، وہ اسی قدر عقیدہ ولاء وبراء کے باب میں ضلالت وگمراہی کے غار میں جا گرتا ہے، اس کے دل میں بدعت اور اہل بدعت سے بغض ونفرت کی جگہ محبت اور دوستی لینے لگتی ہے، بدعت کی شناعت وقباحت ختم ہونے لگتی ہے، ائمہ سنت اور علمائے سنت کی محبت دل سے رخصت ہونے لگتی ہے اور ائمہ ضلالت وبدعات کی محبت دل میں گھر کرنے لگتی ہے، جس کی وجہ سے دل تاریک اور بیمار ہونے لگتا ہے۔ کیونکہ ائمہ سنت کی کتابیں اور باتیں کتاب وسنت اور آثار سلف سے مزین ہوتی ہیں، اور چونکہ قرآن وسنت کے نصوص سراپا نور ہیں اس لئے وہ دلوں کو نور سے معمور کر دیتے ہیں، ان سے شبہات وشہوات کی تاریکیاں چھٹتی ہیں، حقائق روز روشن کی طرح عیاں ہوتے ہیں،

جبکہ ائمہ بدعت وضلالت کی کتابوں اور باتوں میں اکثر عقلی موشگافیاں، فلسفیانہ گفتگو، قیاس آرائیاں، باطل استدلالات، اور ضعیف وموضوع روایتیں ہوتی ہیں جس کی وجہ سے انہیں پڑھ اور سن کر قلوب واذہان تاریک ہو جاتے ہیں، شبہات وشہوات کا غلبہ شدید تر ہونے لگتا ہے، حق وباطل خلط ملط ہونے لگتا ہے، انسان متشابہات میں الجھ کر محکمات کا انکار کرنے لگتا ہے، پھر دھیرے دھیرے اس کی سوچ وفکر اہل باطل کے سانچے میں ڈھلنے لگتا ہے۔ اور ایک وقت وہ خود محدثات وبدعات کو گلے لگانے لگتا ہے اور حق اور اہل حق کا دشمن بن جاتا ہے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی غلطیوں سے بڑے بڑے نتیجے اخذ کرتا ہے، ان کے تئیں لمز وہمز، طعن وتشنیع، کذب وافتراء کو روا سمجھنے لگتا ہے، جبکہ اس کے بالمقابل اہل بدعت کے لئے تعصب رکھنے لگتا ہے، ان کے بڑے بڑے انحرافات یہاں تک کہ کفریات تک کی تاویلیں کرنے لگتا ہے، اور ان پر رد کرنے والوں کو متشدد اور انتہا پسند قرار دیتا ہے، جبکہ انتہا پسندی اور تشدد یہ ہے کہ انسان کتاب وسنت سے منحرف ہو جائے، فہم سلف سے اعراض کرنے لگے اور دین میں محدثات اور مخترعات کے لئے راہیں ہموار کرنے لگے۔

خود آپ اپنے گرد وپیش کے ماحول پر نظر دوڑائیں، اپنے دوستوں اور ساتھیوں کو ٹٹول کر دیکھیں، ان میں سے جس نے بھی سلف کے اس اصول کو بالائے طاق رکھا، اہل باطل کی کتابوں اور تقریروں کو پڑھنا اور سننا شروع کیا، ان کی کیا حالت ہوئی؟

● اس اصول میں اکابر کا طرز عمل:

اب سوال یہ ہے کہ ہمارے کتنے اکابر ہیں جو اہل بدعت کی صحبت اور ہم نشینی اختیار کرتے تھے؟ یعنی ان کے علمی دروس میں شریک ہوتے تھے اور ان کے ساتھ صبح وشام اٹھتے بیٹھتے تھے؟

اور اگر کسی نے ان کی صحبت اختیار کی ہے تو ان کا ذاتی عمل ہمارے لئے حجت ہے یا پھر صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ سنت کا طرز عمل؟

۳- تیسرا اصول: اہل بدعت سے قطع تعلقی اور ان کا سماجی بائیکاٹ کرنا۔

اس اصول کا مقصد بدعتی کی زجر وتوبیخ ہے، کیونکہ جب سماج میں اس کا بائیکاٹ کیا جائے گا تو وہ بدعت سے تائب بھی ہو سکتا ہے، اور اس سے دوسرے لوگ جو اس کے نقش قدم پر چلنا چاہیں گے ان کی حوصلہ شکنی بھی ہوگی، لیکن یہ مقصد ایسے ماحول میں حاصل نہیں ہو سکتا جہاں اہل بدعت کا غلبہ ہے، وہاں بائیکاٹ سے ہم خود تنہا پڑ جائیں گے، اس لئے ایسی جگہ ان سے ایسے تعلقات قائم رکھنا جن سے یہ ظاہر نہ ہو کہ ہم اپنے اصول اور مسلمات میں ان سے مصالحت کر رہے ہیں جائز ہے بلکہ بسا اوقات دعوت کی افادیت کے اعتبار سے شرعا مطلوب امر بھی ہے۔

ہمارے اکابر اہل حدیث کے بیشتر تعلقات اہل بدعت سے اسی طرح کے تھے، وہ سیاسی، ملی اور سماجی بنیادوں پر ان سے تعلقات رکھتے تھے اور یہ برصغیر کے ماحول میں دعوتی ناحیے سے جائز اور مطلوب امر ہے، لیکن ساتھ ہی وہ بدعت اور اہل

بدعت کے تئیں شدید بھی تھے، انہوں نے ان پر رد کرنے میں کسی طرح کی مداہنت سے کام نہیں لیا ہے۔ ان کے اس طرح کے تعلقات سے یہ استدلال کرنا کہ وہ اہل بدعت سے بغض نہیں رکھتے تھے، وہ اباحیت پسند تھے، وہ ہر طرح کے بدعتی سے گھل مل کر رہنے، ان کی کتابوں کو پڑھنے اور انہیں سننے کو جائز سمجھتے تھے، وہ ائمہ مضلین سے تحذیر کے قائل نہیں تھے، یہ دراصل ان پر بہت بڑا بہتان اور الزام ہے، اور اس غلط استدلال کے ذریعے اہل سنت کے متفقہ دوسرے اصول کو گول کرنے کی کوشش کرنا اکابر کے نام پر بہت بڑا دھوکا اور فراڈ ہے۔

۴- چوتھا اصول: اہل بدعت کی تذلیل و تحقیر کرنا، ان کو سزائیں دینا، ان کو اپنے درمیان سے بھگانا وغیرہ۔

اس اصول کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو اہل بدعت کی کتابوں اور باتوں کے قریب جانے سے حتی الوسع روکا جائے۔ اور اس کے لئے ضروری ہے کہ ائمہ بدعات کے افکار پر رد کرنے سے پہلے خود ان کی اہانت کی جائے، ان کی تحقیر کی جائے اور ان کی شخصیت کو ہی لوگوں کی نگاہ میں کم تر بنایا جائے، کیونکہ انہوں نے خود بدعات کا ارتکاب کرکے اپنی اہانت کی ہے، اور اللہ اور اس کے رسول کی دشمنی مول لی ہے، اور وہ اس کے دین میں فراڈ اور جعل سازی کرتے اور لوگوں کے دین وایمان کو تباہ کرنے کے مجرم قرار پائے ہیں۔

اب اس میں جتنا تساہل برتا جائے گا اور ائمہ سنت کے منہج سے انحراف اختیار کیا جائے گا اسی قدر لوگوں کے دلوں میں اہل بدعت کی تعظیم وتوقیر پیدا ہوگی، اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ لامحالہ دوسرے اصول کو توڑیں گے اور ان کی کتابوں، لیکچرز، اور تقریروں کو سننا شروع کریں گے، جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ لوگ ان کے انحرافات کو قبول کرتے جائیں گے، ان کے شبہات کا شکار ہوں گے، اور عقیدہ ولاء وبراء جو اصول دین میں سے ہے وہ کمزور ہوتا جائے گا۔

اس اصول میں بھی ہمارے اکابر عمومی طور پر منہج سلف کے پیروکار تھے۔ اہل بدعات کے خلاف ان کے جہاد کا طویل سلسلہ اسی کا غماز ہے، لیکن یہاں اس بات کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے تقلید اور اہل تقلید پر رد کرنے میں زیادہ زور صرف کیا، جس کی وجہ سے وہ اس باب میں خط امتیاز کھینچنے میں پوری طرح کامیاب ہوگئے، لیکن تحریکیت اور اہل تحریک کے رد میں وہ اس قدر متوجہ نہیں ہوئے، یا مولانا مودودی کے عدم تقلید کے رجحان کو تقلید وجمود کے زور کو توڑنے میں نفع بخش سمجھ کر اکثر علماء نے ان کے انحرافات سے اغماض کیا۔ حالانکہ سلفیت تقلید اور عدم تقلید کے درمیانی راہ منہج سلف کی پیروی کا نام ہے، مطلقا عدم تقلید بسا اوقات تقلید سے بھی زیادہ ضلالت وگمراہی کا سبب بنتی ہے۔ یا پھر جماعت اسلامی ایک نئی تحریک ہونے کی بنیاد پر اکثر علماء اس کے افکار اور سنگینی سے کما حقہ واقف نہیں ہوئے اور حسن ظن کی بنیاد پر مولانا مودودی کے تئیں نرم گوشہ اختیار کر لیا، حالانکہ انفرادی طور پر کئی علماء نے مودودی کو اور ان کے افکار کو بے نقاب کیا لیکن اس باب میں وہ اجتماعی اور ہمہ گیر کوشش نہیں رہی جو منہج سلف اور تحریکیت کے درمیان خط امتیاز کھینچ سکے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اکثر اہل حدیث جماعت اسلامی میں ضم ہو کر رہ گئے، اور تحریکیت کے جراثیم ان کے اندر سرایت کر گئے، ان کے مدارس کی لائبریریاں اہل تقلید کی

کتابوں سے تو خالی رہیں اور اس میں وہ کامیاب رہے، لیکن مودودی، حسن البناء، سید قطب، قرضاوی اور ان جیسے تحریکی مفکرین کی کتابوں سے پُر رہیں، اور ان کے رد میں جو کتابیں ہمارے بعض اکابر جیسے مولانا ثناءاللہ امر تسری، شیخ محدث گوندلوی، شیخ اسماعیل سلفی اور دیگر حضرات نے لکھی ہیں ان سے اکثر لائبریریاں کھالی رہیں اور آج بھی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ شیخ صلاح الدین یوسف کی کتاب "خلافت وملوکیت" موجود ہے۔ یا اگر کسی لائبریری میں وہ کتابیں ہیں بھی تو بچوں کو ان سے واقف نہیں کرایا جاتا ہے۔

اہل تقلید وجمود کے رد میں ہمارے اکابر نے اس اصول کو تو پوری طرح برتا، لیکن جو نئی تحریکیں جنم لی ہیں ان کے رد میں ہمارے اکابر سے معاملے کی سنگینی کو سمجھنے میں کہیں نا کہیں چوک ہوئی ہے جس کا بہت بڑا خمیازہ جماعت اہل حدیث کو بھگتنا پڑ رہا ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ اس کا فوراتدارک کیا جائے، اور رافضیت، خارجیت، اباحیت سے تیار شدہ اس جدید مذہب اور فتنے سے ہماری جماعت کے نونہالوں کو بچانے کی کوشش کی جائے۔

● تنبیہ:

بہت سارے اہل حدیث لکھاری جو منہج سلف سے کماحقہ واقف نہیں ہیں وہ اپنی نادانی کی بنیاد پر یہ بات اکثر کہتے ہیں کہ شخصیت پر رد نہ کرو بلکہ افکار پر رد کرو، یعنی وہ اس اصول کا انکار کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ پہلے ان کو غار کے کنارے جانے دو، پھر جب وہ اس میں گرنے لگیں تو بچانے کی کوشش کرو، جبکہ کمالِ نصیحت کا تقاضا یہ ہے اور جس کو اسلاف کرام نے اختیار کیا ہے کہ پہلے ہی متنبہ کیا جائے کہ اس جگہ کے قریب مت جاؤ، کیونکہ گڑھے میں گرنے کا ڈر ہے، لیکن اس کے باوجود کوئی اگر نادانی کی بنیاد پر چلا جائے تو پھر اگلی کوشش ہونی چاہئے کہ اسے کیسے بچایا جائے، لیکن اگر کوئی کہے کہ نہیں نہیں سب کو وہاں جانے دو، ڈراؤ مت، خوف مت پھیلاؤ، ہاں جب گرنے لگے تو پھر بچانے کی کوشش کرو، ظاہر ہے ایسی صورت میں اکثریت تو اس میں گر جائے گی، لیکن اگر پہلے متنبہ کیا جائے گا تو اکثریت بچ جائے گی۔

در اصل اہل بدعت کی تحذیر سے روکنے والے یا ان کی تعریف کرنے والے اور ائمہ سلف کی راہ کو ترک کرنے والے ضلالت کے غار کی طرف لوگوں کو پہلے جانے دیتے ہیں، یا پھر لوگوں کو اس کی طرف دعوت دیتے ہیں، پھر وہ بچانے کا مشورہ دیتے ہیں حالانکہ وہ خود گر چکے ہوتے ہیں تو وہ دوسروں کو کیا بچا پائیں گے، یا پھر بچانے والوں پر ہی مختلف مقدمے دائر کر دیتے ہیں۔

اللہ رب العالمین ہم سب کو منہج سلف کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق دے۔

فضائل ماہ شعبان اور بدعات

فضیلۃ الشیخ محمد اشفاق سلفی
مدرس دارالعلوم احمدیہ سلفیہ، دربھنگہ

ماہ شعبان نیکیوں کا ایک خاص موسم ہے جس سے مسلمانوں کی اکثریت غافل ہے، حالانکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس ماہ میں بکثرت نفلی روزے رکھتے تھے۔ ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، فرماتی ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماہ رمضان کے علاوہ کسی مہینے کا مکمل روزہ نہیں رکھا البتہ سب سے زیادہ نفلی روزے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ماہ شعبان میں رکھا کرتے تھے۔(۱)

عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہی مروی ہے: " لم يكن النبي صلى الله عليه وسلم يصوم شهرا أكثر من شعبان، فإنه كان يصوم شعبان كله"۔(۲)

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم ماہ شعبان سے زیادہ کسی مہینے کا نفلی روزہ نہیں رکھتے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پورے شعبان کا روزہ رکھتے تھے۔

اس حدیث میں "پورے ماہ" سے اکثر ایام مراد ہیں نہ کہ مکمل مہینہ اگر چہ بعض اہل علم نے "اکثر روزے" اور "کل روزے" والی حدیثوں کے درمیان یہ تطبیق دی ہے کہ کسی سال اکثر ایام کے روزے رکھتے اور کسی سال پورا مہینہ ھی روزہ سے ہوا کرتے تھے۔ پہلی بات زیادہ صحیح ہے، اس کی تائید صحیح مسلم میں عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث بروایت عبد اللہ بن شقیق اور سنن نسائی میں بروایت سعد بن ہشام ہوتی ہے جس کا لفظ ہے: "ولا صام رسول الله صلى الله عليه وسلم شهرا كاملا منذ قدم المدينة غير رمضان".(۳) جب سے آپ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے سوائے رمضان کے کسی مہینے کا مکمل روزہ نہیں رکھا۔

شعبان میں بکثرت روزہ رکھنے کی کئی وجوہات اہل علم نے بیان کی ہیں لیکن سب سے زیادہ قوی بات وہی ہے جس کا بیان خود زبان رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے بروایت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ صادر ہوا ہے: "ذاك شَهْرٌ يَغفُلُ النَّاسُ عنهُ بينَ رجبٍ ورمضانَ ، تُرفَعُ فيهِ الأعمالُ إلى ربِّ العالمينَ ، فأحبُّ أن يُرفَعَ عمَلي وأَنا صائمٌ"۔(۴)

---

(۱)(صحیح بخاری:۱۹۶۹، صحیح مسلم:۱۱۵۶)۔
(۲)(صحیح بخاری:۱۹۷۰، صحیح مسلم:۱۱۵۶)۔
(۳)(صحیح مسلم:۱۱۵۶، سنن نسائی:۲۳۵۱)۔
(۴)(أحمد والنسائی وغیرہ وحسنہ الالبانی فی صحیح الجامع:۳۷۱۱)۔

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ تعالی عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ماہ شعبان میں بکثرت روزہ رکھنے کی بابت دریافت کیاتو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:"یہ مہینہ رجب اور رمضان کے درمیان ہونے کی وجہ سے لوگوں کی غفلت کا شکار ہے جبکہ اس میں بندوں کے اعمال رب العالمین کی طرف اٹھائے اور اس کے حضور پیش کئے جاتے ہیں لہذا میں چاہتاہوں کہ میرا عمل بحالت روزہ اٹھایاجائے"۔

ماہ شعبان سے لوگوں کی غفلت کا مطلب یہ ہے کہ ماہ رجب حرمت والا مہینہ ہے اور ماہ رمضان ماہ صیام ونزول قرآن ہے۔عام طور پر لوگ ماہ حرام اور ماہ صیام کا خاص اہتمام کرتے ہیں اور شعبان سے غفلت برتتے ہیں اور ماہ رجب میں روزہ رکھنے کو افضل جانتے ہیں جب کہ ماہ رجب میں خصوصی طور پر روزہ رکھنا ثابت نہیں ہے۔شعبان کے روزے دیگر تمام مہینوں کے نفلی روزوں سے افضل ہیں۔اس سے معلوم ہوا کہ کبھی کبھار غیر مشہور واقعات اور جگہیں بلکہ افراد بھی مشہور کے مقابلہ میں افضل ہوتے ہیں۔دوسرا یہ کہ غفلت کے اوقات میں بندگی کی بجاآوری افضل عمل ھے اور اطاعت کرنے والا ریا سے بھی محفوظ رہتاہے۔

علاوہ ازیں بندوں کے اعمال کی رب العالمین کے حضور پیشی یومیہ،ہفتہ وار،سالانہ اور اختتامی یعنی موت کے بعد ہوتی ھے۔روزانہ فرشتوں کی آمد ورفت عصر وفجر کے وقت ہوتی ہے اور اللہ تعالی بندوں کی حالت دریافت کرتا ہے،ہفتہ میں سوموار اور جمعرات کو اعمال پیش کیے جاتے ہیں،ماہ شعبان میں سالانہ پیشی ہوتی ہے،جبکہ موت کے بعد پوری زندگی کے اعمال پیش کیے جاتے ہیں،لہذا روایتوں میں باہمی تعارض نہیں ہے۔اللہ تعالی پر کسی کا کوئی عمل پوشیدہ نہیں ہے پھر بھی پیشی کے بعد پیشی حکمت پر مبنی ہے جسے اللہ تعالی بہتر جانتا ہے۔تاہم ان اوقات کی ہمارے لیے فضیلت ظاہر ہے کہ ہم اعمال کے اٹھائے جانے کے موقعوں پر بطور خاص اعمال مسنونہ کو بجالائیں اور رب تعالی کی رضاوخوشنودی کے مستحق بنیں۔

علامہ ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ نے ماہ شعبان کے روزوں کی افضلیت کی ایک علت یہ بھی بیان کی ہے کہ یہ روزے ٹھیک ماہ رمضان کے فرض روزوں سے پہلے رکھے جاتے ہیں تو گویاان کی حیثیت نماز فرض سے قبل ادا کی جانے والی سنت مؤکدہ کی ہے،جو عام نفلوں سے بہتر وافضل ہے اور اسی طرح ماہ شوال کے چھ روزے فرض نمازوں کے بعد ادا کی جانے والی سنت مؤکدہ کی طرح ہیں۔بہر حال جو نوافل فرض سے آگے اور پیچھے ہوتے ہیں وہ مطلق نوافل کے مقابلے میں افضل ہوتے ہیں۔

یہاں اس تعارض کا دفعیہ بھی مناسب ہے کہ ایک طرف تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ماہ شعبان میں بکثرت روزہ رکھنے کا تھااور دوسری طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:"افضل الصيام بعد رمضان شهر الله المحرم"۔[1]

ماہ رمضان کے بعد سب سے افضل روزے محرم الحرام -جسے بطور تکریم شہر اللہ (اللہ کا مہینہ) کہا گیا ہے- کے روزے ہیں۔اہل علم نے یہ تطبیق دی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یا تو محرم الحرام کے روزے کی افضلیت کا علم اخیر عمر میں

---

(۱)(صحیح مسلم:۱۱۶۳عن ابی ہریرہ)۔

ہوا ہو گا جس کے سبب آپ اس کو عملی جامہ نہ پہنا سکے یا پھر آپ سفر اور بیماری کے سبب محرم کے بکثرت روزہ رکھنے سے معذور رہے ہوں یا پھر اس کو نفل مطلق پر محمول کیا جائے اور یہ سب سے اچھی تطبیق ہے۔

دوسری ایک حدیث جو نصف شعبان کے بعد روزہ رکھنے کی ممانعت پر دلالت کرتی ہے اور محققین کی ایک جماعت نے اس کی تصحیح فرمائی ہے: "اذا انتصف شعبان فلا تصوموا حتی یکون رمضان"۔ (۱)

اس روایت کے تعلق سے امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی بعض اہل علم کے نزدیک یہ ہے کہ آدمی ماہ شعبان کے نصف اول میں روزہ سے نہ ہو اور جب نصف آخر آجائے تو رمضان کے پیش نظر روزے رکھنا شروع کر دے، جیسا کہ امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے بھی اپنی صحیح میں لکھا ہے کہ شعبان کو رمضان سے نہ ملاؤ یا تو پورا شعبان روزہ رکھو یا پھر آخر ماہ میں روزہ رکھنے کی کسی کی عادت ہو تو وہ روزہ رکھے۔

لہذا شعبان کی ۱۶ تاریخ سے آخر ماہ تک آدمی اپنے فرض روزوں کی قضا کر سکتا ہے، منت کے روزے رکھ سکتا ہے اور اسی طرح کسی کی عادت سوموار اور جمعرات کے روزہ رکھنے کی ہو یا وہ جو ایک دن روزہ اور دوسرے دن افطار کرتا ہو تو ایسے سبھی لوگ روزہ رکھ سکتے ہیں جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لا یتقدمن أحدکم رمضان بصیام یوم أو یومین إلا أن یکون رجل کان یصوم صومه فلیصمه"۔ (۲)

یعنی کوئی شخص احتیاطی طور پر شعبان کے آخری ایک دو دنوں کا روزہ نہ رکھے کیونکہ رمضان کا روزہ رویت ہلال پر موقوف ہے۔ لہذا احتیاط کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں اگر کوئی اپنی عادت کے مطابق سوموار یا جمعرات کا دن ہونے کی وجہ سے رکھے تو اور بات ہے، اور اسی بات پر حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالی عنہ کی حدیث کو بھی محمول کیا جائے گا جس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے یا کسی دوسرے صحابی سے کہا: "أصمت من سرر شعبان .....إلی آخر الحدیث۔ (۳)

کیا تم نے شعبان کے آخری ایام میں (جن میں چاند روپوش ہوتا ہے) کے روزے رکھے؟ کہا نہیں آپ نے فرمایا جب رمضان گزر جائے تو دو دن روزہ رکھ لینا۔

عمران بن حصین رضی اللہ تعالی عنہ یا کوئی دوسرے صحابی رضی اللہ تعالی عنہ اخیر ماہ میں عادتاً روزہ رکھا کرتے تھے یا نذر کا روزہ رہا ہو جسے انہوں نے ماہ رمضان کی آمد کے اندیشہ سے یا ایک دو دن قبل روزہ رکھنے کی ممانعت کی وجہ سے نہ رکھا ہو تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اندیشہ کو دور فرمایا کہ صوم معتاد ممانعت کے اندر داخل نہیں ہے۔

---

(۱) (اخرجہ اہل السنن عن ابی ہریرہ، صحیح الجامع: ۳۹۷)۔

(۲) (صحیح البخاری ۱۹۱۴ صحیح مسلم ۱۰۸۲)۔

(۳) (صحیح بخاری: ۱۹۸۳، صحیح مسلم: ۱۱۶۱)۔

پندرھویں شعبان کا ایک روزہ:

پندرہویں شعبان کے ایک روزہ کی حدیث حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ سے سنن ابن ماجہ میں مروی ہے: "إذا كانت ليلة النصف من شعبان فقوموا ليلها وصوموا نهارها".... إلخ۔ (۱)

یعنی جب شعبان کی پندرہویں شب ہو تو رات میں قیام کرو اور دن کا روزہ رکھو کیونکہ اللہ تعالیٰ غروب آفتاب سے طلوع فجر تک نچلے آسمان پر نزول فرماتا ہے اور کہتا ھیکہ: ھے کوئی مغفرت کا طالب کہ میں اسے بخش دوں، ہے کوئی روزی کا طلبگار کہ میں اسے روزی عطا کروں اور ہے کوئی مصیبت زدہ کہ میں اسے عافیت نصیب کروں اور ہے کوئی، اور ہے کوئی ۔۔۔۔الخ۔

واضح ہو کہ اس روایت کی سند میں ابن ابی سبرہ-ابو بکر بن عبد اللہ بن محمد بن سبرہ-ہے جسے امام احمد اور یحیٰ ابن معین رحمہا اللہ نے حدیث گھڑنے والا بتایا ہے، علامہ ابو الحسنات لکھنوی رحمہ اللہ نے من گھڑت احادیث کے ضمن میں مذکور روایت کو بیان کیا ہے، امام بخاری رحمہ اللہ نے ضعیفاور منکر الحدیث اور امام نسائی رحمہ اللہ نے متروک کہا ہے، امام البانی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف جدا یاموضوع کہا ہے۔ (۲) لہٰذا اس روایت سے استدلال جائز نہیں ہے۔

ماہ شعبان میں ایام بیض کے روزوں کا حکم:

ایام بیض سے ہر قمری مہینہ کی تیرہویں، چودھویں اور پندرہویں تاریخیں مراد ہیں، جن میں راتیں بھی دن کی مانند روشن ہوتی ہیں ان ایام کے روزے (ماہ رمضان کو چھوڑ کر) با فضیلت ہیں اور ثواب میں ایک مہینہ کے روزوں کے برابر ہیں کیونکہ نیکیاں (کم از کم) دس گنا بڑھائی جاتی ہیں۔ اس طرح ہر مہینہ تین روزے رکھنے والا شخص سال بھر روزہ رکھنے والے کی طرح ھے۔ اس سلسلے میں صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ، (۳) عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالی عنہما (۴) اور ابو ذر غفاری رضی اللہ تعالی عنہ سے (۵) بسند حسن، احادیث مروی ہیں۔

یقینا سنن و نوافل پر مداومت کرنا افضل ہے، تاہم اگر کوئی کسی مہینے میں ایام بیض کے روزے رکھے اور کسی مہینے میں چھوڑ دے تو کوئی حرج نہیں، لہذا ایام بیض کے روزے کی نیت سے اگر کوئی شخص ماہ شعبان میں روزے رکھتا ہے تو جائز ہے۔ لیکن اگر کسی کے پیش نظر پندرہویں شعبان کے قیام اللیل اور ایک دن کے روزہ کی فضیلت میں وارد موضوع اور منگھڑت

---

(۱) (سنن ابن ماجہ: ۱۳۸۸)۔

(۲) (تحفۃ الأحوذی: ۳۶۶/۳ ، تخریج الالبانی علی سنن ابن ماجہ حدیث نمبر ۱۳۸۸، الآثار المرفوعۃ صفحہ ۸۰-۸۱)۔

(۳) (صحیح بخاری حدیث نمبر: ۱۱۲۴، صحیح مسلم: ۷۲۱) ۔

(۴) (صحیح بخاری: ۱۸۷۴، صحیح مسلم: ۱۱۵۹) ۔

(۵) (سنن ترمذی: ۷۶۱، اور سنن نسائی: ۲۴۲۴) ۔

روایت ہو اور وہ بطور حیلہ دو دن تیرہویں اور چودھویں کے روزے بھی رکھتا ہو تو یہ عمل غیر مشروع ہو گا کیونکہ روزہ رکھنے والے کا بنیادی مقصد صرف پندرہویں شعبان کا روزہ ہے نہ کہ ایام بیض کے روزے۔ علامہ شیخ ربیع مدخلی حفظہ اللہ تعالی نے اپنے فتویٰ میں مذکورہ تفصیل بیان کی ہے جو مزاج شریعت کے عین مطابق ہے۔

ماہ شعبان کی پندرہویں شب:

اہل علم کی ایک جماعت کا موقف ہے کہ شعبان کی پندرہویں شب عام راتوں کی طرح ہے، اس کی کوئی فضیلت دوسری راتوں پر ثابت نہیں ہے اور اس باب میں جتنی بھی روایات آئی ہیں، وہ سب ضعیف اور منکر ہیں۔ امام ابن العربی المالکی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "ليس في ليلة النصف من شعبان حديث يساوي سماعه".[1] پندرہویں شعبان کی شب کے متعلق کوئی ایسی حدیث بھی نہیں ہے جو سننے کے قابل ہو. امام ابن باز رحمہ اللہ نے بھی اس رات کی فضیلت میں وارد روایات کو ضعیف، غیر ثابت اور نا قابل اعتبار کہا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث بحوالہ سنن ابن ماجہ جس کا ذکر سابقہ سطور میں آچکا ہے کہ غروب آفتاب سے طلوع فجر صادق تک رب العالمین نچلے آسمان پر اتر کر بخشش، روزی اور صحت وعافیت عطا کرنے کا اعلان فرماتا ہے، ایک باطل اور من گھڑت روایت ہے۔

دوسری روایت جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک شب میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے بستر پر نہیں پایا تو میں آپ کی تلاش میں نکلی آپ کو بقیع (اہل مدینہ کی قبرستان) میں پایا تو آپ نے (گھر آکر) فرمایا کیا تم اس بات سے ڈرتی تھی کہ اللہ اور اس کا رسول تم پر ظلم کریں گے ؟ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں نے گمان کیا کہ آپ اپنی بعض بیویوں کے پاس کسی ضرورت سے تشریف لے گئے ہوں گے تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالی پندرہ شعبان کی رات کو سماء دنیا پر نزول فرماتا ہے اور قبیلہ کلب کی بکریوں کے بالوں سے زیادہ لوگوں کی مغفرت فرماتا ہے۔[2] اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی سند میں حجاج بن ارطاۃ نامی راوی ہے اور میں نے امام بخاری رحمہ اللہ سے اس کو ضعیف کہتے ہوئے سنا ہے۔ پھر حجاج کا یحییٰ ابن کثیر سے سماع ثابت نہیں ہے اور یحییٰ نے عروہ سے روایت کی ہے اور یحییٰ کا سماع بھی عروہ سے ثابت نہیں ہے اس طرح دو مقامات پر انقطاع ہے لہذا سند متصل نہیں ہے۔

لہذا یہ روایت ضعیف جدا ہونے کے سبب نا قابل اعتبار ھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بقیع غرقد کے اموات کی مغفرت کے لیے ایک رات قبرستان جانا صحیح مسلم اور سنن نسائی میں بسند صحیح ثابت ہے لیکن شعبان کی پندرہویں رات کی قید کے بغیر۔ گویا اصل حدیث صحیح ہے لیکن رات کی تعیین کے ساتھ حدیث ضعیف جدا ہے لہذا پندرہویں شعبان کی شب میں

---

(۱) (عارضۃ الأحوذی: ۲۰۱/۲)۔

(۲) (ترمذی: ۷۳۶، ابن ماجہ: ۱۳۸۹)۔

زیارتِ قبر غیر مسنون عمل ہے البتہ زیارت قبور کبھی بھی تاریخ اور وقت کی تعیین کے بغیر ایک مسنون عمل ہے اس سے آدمی کو اپنی موت یاد آتی ہے اور اموات کو زائرین کی دعاء مغفرت بھی حاصل ہوتی ہے تاہم اپنی طرف سے وقت اور تاریخ کا تعین جائز نہیں ہے۔ بلا دلیل شرعی وقت اور جگہ کی تعیین کسی بھی مسنون و مستحب عمل کو بدعت بنا دیتی ہے۔ ایک روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حوالے سے بیان کی جاتی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: "يَا علی من صلی مائَة رَكْعَة فِي لَيْلَة النّصْف، يَقْرَأُ فِي كُلِّ رَكْعَةٍ بِفَاتِحَةِ الْكتاب وَقل هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ، عَشْرَ مَرَّاتٍ إِلَّا قضى الله لَهُ كل حَاجَة"۔ (۱)

اے علی! جس نے پندرہویں کی شب میں سو رکعت نماز ادا کی اس طور سے کہ ہر رکعت میں سورہ فاتحہ ایک مرتبہ, قل ھو اللہ أحد دس مرتبہ پڑھا تو اللہ تعالی اس کی ہر حاجت پوری فرمائے گا۔ (۲)

اس من گھڑت نماز کو ہزاری نماز بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ ہر رکعت میں دس مرتبہ سورہ اخلاص پڑھی جاتی ہے. سو کو دس سے ضرب دیں تو ایک ہزار ہوتا ہے۔ والعیاذ باللہ۔ مخصوص کیفیات، محدود رکعات اور متعین ومعدود سورتوں کے ساتھ نماز ادا کرنا قبیح بدعت ہے۔ اس نماز کی بدعت ابن ابی الحمراء نابلسی فلسطینی نے ۴۴۸ھ میں بیت المقدس میں پہلی مرتبہ شروع کی تھی، اچھی تلاوت کرتا تھا اس کے پیچھے ایک آدمی نے نماز شروع کی پھر دو، تین، چار لوگ شریک ہو گئے اور سو رکعت سے فراغت کے وقت ایک بڑی جماعت اس کی اقتدا میں موجود پائی گی گئی۔ رفتہ رفتہ یہ بدعت چل پڑی۔

علامہ عراقی نے احیاء العلوم کی تخریج میں اس کو باطل قرار دیا ہے. لہذا کسی کو امام غزالی رحمہ اللہ کی کتاب میں اس نماز کے ذکر سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے، یہ ایک منکر اور قبیح عملی اور موسمی بدعت ہے جس سے اجتناب لازم ہے.

یہ اور اس جیسی دوسری نماز جو صلاۃ الرغائب کے نام سے مخصوص کیفیت کے ساتھ ماہ رجب کی پہلی شب جمعہ کو ادا کی جاتی ھے، سراسر باطل ہیں، جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین تو کجا، ائمہ کرام امام ابو حنیفہ، مالک، شافعی اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالی سے بھی ثابت نہیں ہے۔

پندرہویں شب کی فضیلت میں وارد بعض حدیث کو محدث عصر امام البانی رحمہ اللہ تعالی نے اور ان سے قبل بھی بعض محققین مثلا علامہ مبارکپوری رحمہ اللہ وغیرہ نے حسن یا صحیح قرار دیا ہے اور وہ حدیث یہ ہے: "ن الله ليطلع في ليلة النصف من شعبان فيغفر لجميع خلقه إلا لمشرك أو مشاحن". (۳)

---

(۱)(اسے ابن الجوزی نے الموضوعات میں ذکر کیا ہے: ۱۲۷/۲)۔

(۲)(اس روایت کو امام ابن الجوزی، امام شوکانی اور علامہ عبد الحی لکھنوی نے باطل اور من گھڑت کہا ہے: الفوائد المجموعۃ ص ۵۰ والإبداع للشیخ علی محفوظ: ۲۲۸-۲۸۶ والآثار المرفوعۃ ص ۸۱)۔

(۳)سنن ابن ماجہ: (۱۳۹۰).

یعنی اللہ تعالی پندرہویں شعبان کی شب میں (بندوں کی طرف) متوجہ ہوتا ہے، چنانچہ مشرک اور بغض وعداوت رکھنے والے کے علاوہ ہر کسی کی مغفرت فرماتا ہے۔

امام البانی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں کہ: یہ حدیث صحیح ہے جو متعدد صحابہ مثلاً معاذ بن جبل، ابو ثعلبہ الخشنی، عبداللہ بن عمرو، ابو موسی اشعری، ابو ہریرہ، ابو بکر صدیق، عوف بن مالک اور عائشہ (رضي الله عن الجميع وأرضاهم) سے مختلف سندوں سے منقول ہے جس سے حدیث میں تقویت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ بلاشبہ درجہ ضعف سے نکل کر درجہ صحت تک پہنچ جاتی ہے۔[1]

آگے علامہ فرماتے ہیں کہ: **اس حدیث کے ثبوت سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ رات عبادت کا خاص موسم بھی ہے جس میں لوگ جمع ہو کر عبادت بجالائیں۔** حدیث کا مفاد صرف اتنا ہے کہ آدمی خود کو شرک اور عداوت سے پاک رکھے تاکہ مغفرت الہی کا مستحق ٹھہرے. اس رات میں کسی عبادت کا بیان نہیں ہے، آدمی اپنی عادت کے مطابق نماز پڑھے تلاوت اور ذکر و دعا کرے لیکن خلاف عادت صرف اس رات میں جاگنا، قبروں کی زیارت کرنا، وعظ و تذکیر کی مجلس منعقد کرنا، اور تہجد پڑھنا صدقہ وخیرات کرنا اور عمدہ کھانے اور تحفے دینا عمل جائز نہیں۔

ملک شام کے بعض تابعین جیسے خالد بن معدان مکحول اور لقمان بن عامر وغیرہم سے اس رات کی تعظیم اور اس میں عبادت کا خاص اہتمام منقول ہے اور لوگوں نے انہیں سے یہ عمل لیا ہے، ورنہ سنت نبویہ اور سنت خلفاء راشدین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنھم سے کچھ بھی ثابت نہیں ہے۔

علماے شام اس رات کی عبادت کے سلسلے میں دو نظریات کے حامل ہیں ایک قول مسجد میں اجتماعی عبادت کے استحباب کا ہے تو دوسرا قول انفرادی عبادت کے جواز کا ہے.

لہذا اس قول کی بنیاد پر مسجد میں نمازوں دعاؤں اور قصہ گو حضرات کی باتوں کے لیے اکٹھا ہونا مکروہ ہے. علامہ ابن رجب رحمہ اللہ نے اپنا میلان بھی اسی کی طرف ظاہر کیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس رات کی عبادت کے متعلق کوئی ثبوت موجود نہیں ہے تو امام اوزاعی اور ابن رجب وغیرھما کا انفرادی قیام اللیل اور تلاوت ودعا کو مستحب قرار دینا بھی کیونکر صحیح ہو سکتا ہے؟ کوئی بھی چیز جو شرعی دلیل سے ثابت نہ ہو وہ کسی بھی صورت مستحب نہیں ہو سکتی خواہ اسے انفرادی یا اجتماعی، ظاہری یا باطنی کسی بھی طریقہ پر انجام دیا جائے۔

---

(۱)(السلسلۃ الصحیحۃ: ۳/۱۳۸-۱۳۹)۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح ارشاد ہے: "مَنْ عَمِلَ عَمَلاً لَيْس عَلَيْهِ أَمْرُنا؛ فَهُوَ رَدٌّ". (۱) جس عمل پر میرا حکم نہ ہو (شرعی دلیل نہ ہو) وہ عمل مردود ہے۔ (۲)

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ وغیرہ سے جو بات نقل کی جاتی ہے کہ سورہ دخان کی آیات ۲ اور ۳ میں "ليلة مباركة" سے مراد شعبان کی پندرہویں شب ہے یہ قول بشرط صحت نقل بھی غلط ہے۔ جس لیلہ مبارکہ میں قرآن مجید کے نزول کی بات اللہ رب العالمین نے بیان فرمائی ہے وہ وہی لیلۃ القدر ہے جو ماہ رمضان کے آخری عشرے میں ہے، جس میں سال بھر کے محکم فیصلے، موت اور روزی وغیرہ سے متعلق معاملات لوح محفوظ سے نقل کر کے فرشتوں کے حوالے کر دیئے جاتے ہیں، جیسا کہ سورہ القدر میں اس کی صراحت موجود ہے۔

ابن ابی ملیکہ رحمہ اللہ سے کہا گیا کہ زیاد نمیری (قصہ گو) کہتا ہے کہ ماہ شعبان کی پندرہویں شب کی عبادت لیلۃ القدر کی عبادت کے برابر ہے، تو فرمایا کہ اگر میں اسے ایسا کہتے ہوئے سنتا اور میرے ہاتھ میں عصا ہوتی تو میں اسے ضرور مارتا۔ (۳)

لہذا پندرہویں شب کو شب برات (چھٹکارے کی رات) کہنا اس میں نماز ادا کرنا صدقہ و خیرات کرنا اور حلوے بانڈے اور عمدہ کھانے تیار کرنا ایسی چیزیں ہیں جن کی کوئی اصل کتاب اللہ اور سنت مصطفی میں نہیں ہے اور نہ ہی اس طرح کا کوئی عمل سلف امت سے جو لائق اقتدا ہیں، ثابت ہے۔ لہذا جو شخص بھی اپنے نفس کا خیر خواہ ہو اور اپنے اعمال صالحہ کی بربادی سے بچنے کا خواہاں ہو اسے بدعات و خرافات سے پرہیز کرنا چاہیے۔

---

(۱) (صحیح مسلم: ۱۷۱۸)۔

(۲) (فتاویٰ الامام ابن باز: ۱/۱۸۹)۔

(۳) (الباعث علی إنکار البدع: ۱/۳۵)۔

کیا مسلم حکمرانوں کے خلاف خروج (بغاوت) مختلف فیہ مسئلہ ہے؟ (قسط ثانی)

حافظ علیم الدین یوسف
جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ

حاکم کے خلاف خروج کا مسئلہ ان اہم مسائل میں سے ایک ہے جسے سلف صالحین نے اہل سنت کے خصوصی اعتقاد میں ذکر کیا ہے، اور جسے اہل سنت واہل بدعت کے درمیان حد فاصل بھی بتایا ہے۔ سلفیت کی طرف نسبت رکھنے والے بعض افراد نے اس مسئلہ کے مختلف فیہ ہونے کا دعوی کیا ہے، ان کے دعوی کی تردید اور مسئلہ میں درست راہنمائی کی غرض سے چند صفحات پر مشتمل اس تحریر کی پہلی قسط گزشتہ شمارے میں نظر نواز ہوئی۔ دوسری قسط پیش خدمت ہے۔ (ادارہ)۔

(۸)عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ أَبِي سُفْيَانَ – رضي الله عنه – قَالَ: لَمَّا خَرَجَ أَبُو ذَرٍّ – رضي الله عنه – إِلَى الرَّبَذَةِ، لَقِيَهُ رَكْبٌ مِنْ أَهْلِ الْعِرَاقِ، فَقَالُوا: يَا أَبَا ذَرٍّ، قَدْ بَلَغَنَا الَّذِي صُنِعَ بِكَ، فَاعْقِدْ لِوَاءً يَأْتِكَ رِجَالٌ مَا شِئْتَ، فَقَالَ: مَهْلًا يَا أَهْلَ الْإِسْلَامِ، فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ – صلى الله عليه وسلم – يَقُولُ: "سَيَكُونُ بَعْدِي سُلْطَانٌ فَأَعْزِرُوهُ، مَنِ الْتَمَسَ ذُلَّهُ، ثَغَرَ ثَغْرَةً فِي الْإِسْلَامِ، وَلَمْ يُقْبَلْ مِنْهُ تَوْبَةٌ حَتَّى يُعِيدَهَا كَمَا كَانَتْ".

ترجمہ: معاویہ بن ابو سفیان رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: جب ابو ذر رضی اللہ عنہ مقام ربذہ میں سکونت پذیر ہوئے تو ایک عراقی قافلہ ان سے آکر ملا اور کہا: اے ابو ذر! ہمیں آپ کے ساتھ کئے گئے سلوک کی خبر ملی، آپ (اپنی سرداری کا) ایک علَم بنا لیں، آپ جہاں سے چاہیں گے وہاں سے لوگ آپ کے پاس آئیں گے، (یہ سن کر) ابو ذر رضی اللہ نے فرمایا: مسلمانو! ذرا صبر سے کام لو، کیوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے: میرے بعد (مسلم) حکمراں آئیں گے، ان کی مدد کرنا، جس نے ان کی تذلیل کی کوشش کی اس نے اسلام (کے قلعہ) میں شگاف ڈالنے کا کام کیا ہے، اور اس وقت تک اس کی توبہ قبول نہیں کرے گا جب تک کہ اس شگاف کی اصلاح کرکے اسے پہلے کی طرح نہ بنادے۔[1]

(۹)عَنْ مُعَاوِيَةَ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «إِنَّ السَّامِعَ الْمُطِيعَ لَا حُجَّةَ عَلَيْهِ، وَإِنَّ السَّامِعَ الْعَاصِيَ لَا حُجَّةَ لَهُ».

(۱)السنۃ لابن أبی عاصم: ۱۰۷۹ (۵۱۳/۲)۔ اسے علامہ البانی رحمہ اللہ نے "ظلال الجنۃ" میں صحیح کہا ہے: (۱۰۷۹)۔

ترجمہ: معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: (اپنے حکمراں کے) احکام سن کر ان کی اطاعت کرنے والے کے خلاف کوئی حجت نہیں ہوگی اور (اپنے حکمراں کے) احکام سن کر ان کی نافرمانی کرنے والے کے لئے کوئی شے حجت نہیں ہوگی۔(۱)

(۱۰)عَنْ عَدِيِّ بْنِ حَاتِمٍ، قَالَ: قُلْنَا: يَا رَسُولَ اللهِ، لَا نَسْأَلُكَ عَنْ طَاعَةِ مَنِ اتَّقَى وَأَصْلَحَ، وَلَكِنْ مَنْ فَعَلَ وَفَعَلَ، يَذْكُرُ الشَّرَّ فَقَالَ: «اتَّقُوا اللهَ وَاسْمَعُوا وَأَطِيعُوا».

ترجمہ: عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ: ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ، ہم آپ سے متقی اور پرہیز گار شخص کی اطاعت و فرمانبرداری کے تعلق سے سوال نہیں کرتے، بلکہ ایسے شخص کے متعلق سوال کرتے ہیں جو ایسا ایسا کرتا ہے - یعنی گناہ گار اور اصحاب شر ہوتے ہیں- تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ سے ڈرو! اور (حاکم کی) سمع وطاعت کرو۔(۲)

(۱۱) عَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ، عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : خِيَارُ أَئِمَّتِكُمُ الَّذِينَ تُحِبُّونَهُمْ وَيُحِبُّونَكُمْ، وَيُصَلُّونَ عَلَيْكُمْ وَتُصَلُّونَ عَلَيْهِمْ، وَشِرَارُ أَئِمَّتِكُمُ الَّذِينَ تُبْغِضُونَهُمْ وَيُبْغِضُونَكُمْ، وَتَلْعَنُونَهُمْ وَيَلْعَنُونَكُمْ، قِيلَ : يَا رَسُولَ اللَّهِ، أَفَلَا نُنَابِذُهُمْ بِالسَّيْفِ؟ فَقَالَ : لَا، مَا أَقَامُوا فِيكُمُ الصَّلَاةَ، وَإِذَا رَأَيْتُمْ مِنْ وُلَاتِكُمْ شَيْئًا تَكْرَهُونَهُ، فَاكْرَهُوا عَمَلَهُ، وَلَا تَنْزِعُوا يَدًا مِنْ طَاعَةٍ.

ترجمہ: عوف بن مالک رضی اللہ تعالی عنہ نے نبی ﷺ سے روایت کی کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تمہارے بہترین امام (خلیفہ) وہ ہیں جن سے تم محبت کرو اور وہ تم سے محبت کریں، تم ان کے لیے دعا کرو اور وہ تمہارے لیے دعا کریں اور تمہارے بدترین امام وہ ہیں جن سے تم بغض رکھو اور وہ تم سے بغض رکھیں، تم ان پر لعنت کرو اور وہ تم پر لعنت کریں۔“ عرض کی گئی: اللہ کے رسول ﷺ! کیا ہم ان کو تلوار کے زور سے پھینک (ہٹا) نہ دیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”نہیں، جب تک کہ وہ تم میں نماز قائم کرتے رہیں اور جب تم اپنے حکمرانوں میں کوئی ایسی چیز دیکھو جسے تم ناپسند کرتے ہو تو اس کے عمل کو ناپسند کرو اور اس کی اطاعت سے دستکش نہ ہو۔“(۳)

(۱۲) عن عِيَاضُ بْنُ غَنْمٍ رضي الله عنه أنه سمع رَسُولَ اللهِ – صلى الله عليه وسلم – يَقُولُ: "مَنْ كَانَتْ عِنْدَهُ نَصِيحَةٌ لِذِي سُلْطَانٍ فَلَا يُكَلِّمْهُ بِهَا عَلَانِيَةً وَلْيَأْخُذْ بِيَدِهِ فَلْيَخْلُ بِهِ، فَإِنْ قَبِلَهَا قَبِلَهَا، وَإِلَّا كَانَ قَدْ أَدَّى الَّذِي لَهُ وَالَّذِي عَلَيْهِ".

---

(۱)السنۃ لابن أبی عاصم:۱۰۵۶(۲/۵۰۳). اسے علامہ البانی رحمہ اللہ نے "ظلال الجنۃ" میں صحیح کہا ہے:(۱۰۵۶)۔

(۲) المعجم الکبیر للطبرانی(۱۷/۱۰۱)، صححہ الالبانی فی ظلال الجنۃ:(۱۰۶۹).

(۳)(صحیح مسلم:۳۵۵۶).

ترجمہ: شریح بن عبید الحضرمی بیان کرتے ہیں کہ: عیاض بن غنم رحمہ اللہ نے فرمایا، رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: "جو شخص کسی مسلمان حاکم کو کوئی نصیحت کرنا چاہے، اسے علی الاعلان سب کے سامنے بیان نہ کرے، بلکہ اس کا ہاتھ پکڑ کے علیحیدگی میں لے جائے (پھر اسے نصیحت کرے)، اگر اس نے نصیحت قبول کرلی تو مقصود حاصل ہو گیا ورنہ اس نے اپنی ذمہ داری ادا کر دی"۔ (۱)

مذکورہ تمام احادیث کا ماحصل یہ ہے کہ: مسلم حاکم اگر گناہ کا حکم نہ دے تو اس کی اطاعت واجب ہے، خواہ وہ ہمارے پسندیدہ امور کے تعلق سے حکم دے یا ناپسندیدہ امور کے تعلق سے، مشکل سے مشکل حالات ہوں یا آسائشیں میسر ہوں، ہمارے حقوق سلب کرنے والا ہو یا ہمیں ہمارے حقوق سے محروم کرنے والا، ہم پر ظلم کرنے والا ہو یا ہمیں عذاب سے دوچار کرنے والا؛ بہر حال اس کی اطاعت لازم ہے، اس کی فرمانبرداری واجب ہے، کیوں کہ ہماری ذمہ داریوں اور واجبات کے تعلق سے اللہ رب العالمین ہم سے سوال کریں گے اور ہمارا محاسبہ ہو گا، کہ ہم نے اپنے اوپر عائد ذمہ داریاں ادا کی یا نہیں، اور حکمرانوں سے ان کی ذمہ داریوں سے متعلق سوال کیا جائے گا کہ انہوں رعایا کے ساتھ کیسا سلوک کیا تھا، لہذا ہم اپنے اوپر واجب حقوق اور ذمہ داریاں ادا کرتے رہیں اور اپنا حق اللہ رب العالمین سے مانگیں، اگر ہم نے ایسا کیا (یعنی مسلم حکمرانوں کے حقوق کی ادائیگی کی اور ان ے ظلم و جور پر صبر کیا) تو اللہ رب العالمین قیامت کے دن ان سے ہمارے حقوق کے تعلق سے سوال کرے گا، اور اگر انہوں بزور قوت ہم سے کوئی غیر شرعی کام کروایا تو اللہ رب العالمین کے ہمیں بری کر کے ہمارے گناہوں کا بوجھ بھی ان کے کاندھوں پر ہی رکھے گا۔ یاد رہے کہ جس کسی نے کسی مسلم حاکم کی لغزشیں تلاش کر کے اس کی تذلیل کی کوشش کی، وہ اسلام کو منہدم کرنے کی کوشش میں لگا ہے، اور ایسے لوگوں کی توبہ اس وقت تک قبول نہیں ہو گی جب تک کہ اس کی تلافی نہ کر دے۔ ہاں شریعت نے حکمرانوں کی غلطیوں کی اصلاح کے لئے نصیحت کا باب کھولے رکھا ہے، البتہ نصیحت کے کچھ آداب و ضوابط اور قیود و شروط ہیں۔

۱- جس شے کے تعلق سے نصیحت کرنا چاہتا ہے، شرعاً وہ نصیحت کہلاتی ہو۔ کیوں کہ جو لوگ مردوں سے استغاثہ جائز سمجھتے ہیں ان کے نزدیک اس امر میں رکاوٹ ڈالنا یا اس سے منع کرنا منکر امر ہے، لہذا وہ اس کے تعلق سے گفتگو کرنے کو نصیحت کہیں گے۔ حالانکہ یہ سراسر شرک ہے۔ اسی طرح صوفیا حضرات اپنے مروجہ طور طریقوں کی مخالفت کو منکر گردانتے ہیں، لہذا ان کے نزدیک اس کے ترک پر انکار کرنا نصیحت میں شامل ہو گا، حالانکہ شریعت کے مخالف امور نصیحت میں داخل نہیں ہو سکتے۔

---

(۱) المعجم الکبیر للطبرانی (۳۶۷/۱۷)، اسے علامہ البانی رحمہ اللہ نے "ظلال الجنۃ" میں صحیح کہا ہے: (۱۰۹۸).

۲- جس برائی یا گناہ کے تعلق سے نصیحت کرنا چاہتا ہے اسے حاکم کی پیٹھ پیچھے اوروں کے سامنے علی الاعلان بیان نہ کرے۔ جیسا کہ آج کل کے منحرفین کا شیوہ ہے۔ بلکہ واجب یہ ہے کہ اس نصیحت کو اپنے دل میں رکھے یہاں تک کہ حاکم کو جا کر بیان کرے۔

۳- حاکم کو اکیلے میں لے جا کر نصیحت کرے۔ یعنی اس کے سامنے جا کر دوسرے لوگوں کی موجودگی میں بیان نہ کرے۔

۴- نصیحت کرنے میں نرمی کا مظاہرہ کرے۔

اب اگر حاکم نے اس کی نصیحت مان لی تو مقصود حاصل ہو گیا اور نہیں مانی تو اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گیا۔

یہاں میں یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ آخر الذکر حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے ہرگز یہ نہیں کہا کہ: اگر نصیحت قبول نہ کرے تو علی الاعلان سب کے سامنے منبروں پر اسے بیان کرو، یا مجمع میں اس کے تعلق سے سب کو بتاتے پھرو۔ سب کو بھڑکاؤ، چیک چیخ کر حاکم کی غلطیاں لوگوں کو سناؤ، یہ حق گوئی ہے، یہ باطل کے خلاف حق کی للکار ہے، اور خاموش رہنے والا مجرم ہے، خاموش رہنے والا چاپلوس ہے۔ ہرگز ہرگز یہ نہیں کہا، بلکہ نبوی ہدایت تو یہ ہے کہ اگر تنہائی میں کی گئی نصیحت کارگر نہ ہوئی تو آپ کا کام ختم ہو گیا، اب آپ خاموشی اختیار کریں، سب کے سامنے حاکم کی غلطیاں بیان نہ کریں۔ کیوں کہ یہ تو واضح طور سے حدیث میں منع ہے۔

اجماع امت

(۱) عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، قَالَ: نَهَانَا كُبَرَاؤُنَا مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «لَا تَسُبُّوا أُمَرَاءَكُمْ، وَلَا تَغِشُّوهُمْ، وَلَا تَبْغَضُوهُمْ، وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاصْبِرُوا؛ فَإِنَّ الْأَمْرَ قَرِيبٌ».

ترجمہ: انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ: ہمیں کبار صحابہ منع کرتے ہوئے فرماتے تھے: اپنے حکمران کو برا بھلا مت کہو، نہ ان کے ساتھ خیانت کرو اور نہ ہی ان سے بغض رکھو، اللہ سے ڈرو اور صبر کرو، کیوں کہ فیصلے کا دن قریب ہے۔[1]

(۲) امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: « أَجْمَعَ تسعون رَجُلاً مِن التَّابِعِينَ، وأَئِمَّة المسْلِمِينَ وَأَئِمَّة السَّلَفِ وفُقَهاء الأَمْصَارِ، عَلى أنَّ السُّنّة التي تُوُفِّيَ عَلَيْهَا رَسُولُ الله صَلَّى اللهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ ... . وَذَكَر مِنْهَا: والصّبر تحتَ لِوَاء السُّلطان عَلَى مَا كَانَ مِنْهُ مِنْ عَدْلٍ أو جَوْرٍ، ولا نَخرُج عَلَى الأُمرَاء بالسَّيْفِ وَإِنْ جَارُوا».

---

(۱) السنۃ لابن أبی عاصم: (۱۰۱۵). صححہ الألبانی فی ظلال الجنۃ: (۱۰۱۵).

ترجمہ: تابعین میں سے ۹۰ تابعین کرام اور ائمہ اسلام وائمہ سلف اور تمام فقہا کا اس امر پر اتفاق ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا متعین کردہ وہ طریقہ جس پر آپ ﷺ کی وفات ہوئی اس میں سے ایک یہ ہے کہ: حاکم عادل ہو یا ظالم، اس کے جھنڈے تلے صبر کے ساتھ رہنا ہے، اور ہم ان کے خلاف اسلحہ نہیں اٹھائیں گے، خواہ انہوں نے ہم پر ظلم ہی کیوں نہ کیا ہو۔[1]

(۳) امام ابو الحسن الاشعری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: «الإجمَاعُ الخَامِسُ وَالأَرْبَعُونَ: وَأَجْمَعُوا عَلى السَّمْعِ والطَّاعَةِ لِأَئِمَّةِ المسْلِمِينَ وَعَلَى أَنَّ كُلَّ مَنْ وَلِيَ شَيْئاً مِنْ أُمورِهِم عَنْ رِضَى أَوْ غَلَبَةٍ وامتَدَّتْ طاعَتُه مِن بَرّ وفَاجِرٍ لاَ يَلْزَمُ الخرُوج عَلَيْهِم بِالسَّيْفِ جَارَ أَو عَدَلَ، وعَلَى أَنْ يَغْزُوا مَعَهُم العَدُو، ويحجّ مَعهم البَيت، وتُدفَع إِلَيهِمْ الصَّدَقَات إِذَا طَلَبُوهَا ويُصَلَّى خَلْفَهُم الجُمع والأَعْيَاد».

ترجمہ: اجماع نمبر ۴۵: مسلم حکمرانوں کی سمع و طاعت پر اجماع ہے، اور رضا مندی یا غلبہ حاصل کر کے جو شخص مسلمانوں کا والی بنا ہو اور ان کی اطاعت نیک و بد تمام لوگ کرنے لگے ہوں تو ان کے خلاف خروج جائز نہیں، خواہ عادل حکمران ہو یا ظالم، ان کے ساتھ مل کر دشمنوں کے خلاف غزوہ کیا جائے گا، نیز ان کے ساتھ حج کیا جائے گا، جب وہ طلب کریں تو انہیں زکوۃ سونپی جائے اور ان کی اقتدا میں جمعہ اور عیدین کی نمازیں ادا کی جائیں گی۔[2]

(۴) امام مزنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: «وَالطَّاعَة لأُولي الْأَمر فِيمَا كَانَ عِنْد الله عَزَّ وَجل مَرْضِيًّا وَاجْتنَاب مَا كَانَ عِنْد الله مسخطا وَتَرْكُ الْخُرُوج عِنْد تَعَدِّيهِم وَجَوْرِهِمْ وَالتَّوْبَة إِلَى الله عز وَجل كَيْمَا يعْطف بهم على رَعِيَّتِهِمْ»۔ ثُمَّ قَال بَعْدُ: «هَذِه مَقَالاتٌ وأَفْعَالٌ اجْتَمَعَ عَلَيْهَا الماضُونَ الْأَوَّلونَ مِن أَئِمَّة الْهُدَى وَبِتَوْفِيقِ الله اعْتَصَمَ بهَا التابعون قدْوَة ورِضَى وَجَانَبُوا التَّكَلُّف فِيمَا كفوا فسُدِّدُوا بِعَوْنِ الله وَوُفِّقُوا لم يَرْغَبُوا عَن الِاتِّبَاع فيقَصّرُوا وَلم يُجَاوِزُوهُ تَزَيُّدا فيعتدوا فَنحْن بِالله واثِقُون وَعَلَيهِ مُتَوَكِّلُون وَإِلَيْهِ فِي اتِّبَاع آثَارِهِم رَاغِبُونَ».

ترجمہ: امام شافعی رحمہ اللہ کے شاگرد خاص امام مزنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جو امور اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہیں ان میں ولی الامر کی اطاعت کرنا اور جو اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں ان سے اجتناب کرنا، ظلم و ستم کے سبب ان کے خلاف خروج نہ کرنا اور رب تعالیٰ سے توبہ و استغفار کرنا تا کہ اللہ رب العالمین اسے اپنی رعایا پر نرمی کرنے کی توفیق عطا فرمائے".....".مذکورہ تمام افعال و اقوال پر سلف صالحین کی اولین جماعت صحابہ کرام کا اجماع ہے، اور رب تعالیٰ کی توفیق سے تابعین عظام نے صحابہ کرام کو اپنا اسوہ و نمونہ مان کر ان کے اس منہج کو لازم پکڑا اور جن امور سے وہ دور رہے ان سے تابعین نے بھی دوری بنائے رکھی، لہذا اللہ کی توفیق سے وہ راہ حق پر ثابت رہے اور حق کے مطابق چلتے رہے، اتباع سے بے

---

(۱) الجامع لعلوم الإمام أحمد-العقیدۃ: (۳/۳۲)۔

(۲) رسالۃ إلی أہل الثغر بباب الأبواب: (ص: ۱۶۸-۱۶۹)۔

اعتنائی نہیں برتی کہ کوتاہ عمل ٹھہریں اور نہ ہی ان سے آگے قدم بڑھائے کہ حدود کی پامالی کرنے والے ٹھہریں، لہذا ہم اللہ پر توکل اور اعتماد کرتے ہوئے صحابہ کے نقش قدم کی پیروی کرتے ہوئے اللہ رب العالمین کی طرف رواں دواں ہوتے ہیں۔[1]

(۵) امام ابن بطہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: «وقَدْ أجْمَعَت العُلماءُ مِن أَهْلِ الفِقْهِ والعِلْم والنُّسَّاك والعُبَّاد والزُّهَّاد مِن أوَّل هَذِهِ الأُمَّةِ إلى وَقْتِنَا هَذا: أنَّ صلاةَ الجمُعَة وَالعِيدَيْنِ ومِنَى وعَرَفَات وَالغَزْو مَع كلّ أَميرٍ بَرٍ وفَاجرٍ... والسَّمْع والطَّاعَة لِمن وَلُّوه وَإِنْ كَانَ عَبْداً حَبَشِياً إلا فِي مَعْصِيةِ الله تَعَالى، فَلَيْسَ لمخْلُوقٍ فِيهَا طَاعَة».

ترجمہ: عہد صحابہ سے لے کر ہمارے اس زمانے تک کے تمام فقہا، علما، عابد وزاہد اور اہل صلاح کا اتفاق ہے کہ نماز جمعہ وعیدین منی اور عرفات جیسے نسک کی ادائیگی اور غزوہ وغیرہ تمام امراء کے ساتھ کیا جائے گا خواہ وہ نیک ہو یا فاجر..... نیز ان کی بھی اطاعت لازم ہے جنہیں حاکم نے ہمارے اوپر والی مقرر کیا ہو خواہ وہ حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو، الا یہ کہ وہ گناہ کرنے کا حکم دے، کیوں کہ ایسی صورت میں مخلوق کی اطاعت نہیں کی جائے گی۔[2]

(۶) امام ابن منذر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: «كُلَّ مَنْ يُحْفَظُ عَنْهُ مِنْ عُلَمَاءِ الْحَدِيثِ كَالْمُجْمِعِينَ عَلَى اسْتِثْنَاءِ السُّلْطَانِ لِلْآثَارِ الْوَارِدَةِ بِالْأَمْرِ بِالصَّبْرِ عَلَى جَوْرِهِ وَتَرْكِ الْقِيَامِ عَلَيْهِ».

ترجمہ: تمام محدثین جن کے اقوال ہمیں حفظ ہیں وہ اس امر پر متفق ہیں کہ حاکم کے ظلم وستم پر صبر کرنے اور ان کے خلاف خروج کرنے کی ممانعت سے متعلق وارد شدہ آثار کے سبب حکام کو اس مسئلے میں استثنائی صورت حاصل ہے۔

(۷) امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: « أَمَّا الْخُرُوجُ عَلَيْهِمْ وَقِتَالُهُمْ فَحَرَامٌ بِإِجْمَاعِ الْمُسْلِمِينَ وَإِنْ كَانُوا فَسَقَةً ظَالِمِينَ، وَقَدْ تَظَاهَرَتِ الْأَحَادِيثُ بِمَعْنَى مَا ذَكَرْتُهُ».

ترجمہ: مسلم حکمرانوں کے خلاف خروج کرنے اور ان سے قتال کرنے کی حرمت پر مسلمانوں کا اجماع ہے، خواہ فاسق اور ظالم ہی کیوں نہ ہو، اس مذکورہ معنی میں بے شمار احادیث وارد ہوئی ہے۔[3]

(۸) امام بخاری رحمہ اللہ نے مشرق ومغرب کے ۱۰۰۰ سے زائد علما اور چھیالیس سالوں سے زائد عرصہ کا اتفاق نقل کیا ہے کہ مسلم حکمران کے خلاف خروج جائز نہیں ہے۔[4]

---

(۱) شرح السنۃ للمزنی: (ص:۴۸و۸۹)۔

(۲) الشرح والإبانۃ علی أصول السنۃ والدیانۃ لابن بطۃ العکبری: (ص:۲۵۹-۲۶۰)۔

(۳) شرح النووی علی مسلم: (۲۲۹/۱۲)۔

(۴) شرح أصول اعتقاد أہل السنۃ والجماعۃ: (۱۹۷/۱)۔

ان کے علاوہ جن علمانے اجماع کی صراحت کی ہے ان میں مندرجہ ذیل علما کے نام سر فہرست ہیں: امام ابو زرعہ [۱]، امام ابو حاتم [۲]، امام ابن ابی حاتم [۳]، امام علی بن المدینی [۴]، امام ابو بکر الاثرم [۵]، امام مزنی [۶]، امام ابو جعفر الطحاوی [۷]، امام ابو بکر الاسماعیلی [۸]، امام ابو عثمان الصابونی [۹]، امام ابن بطہ [۱۰]، امام کرمانی [۱۱]، امام ابن عبد البر [۱۲]، امام ابو الحسن الاشعری [۱۳]، امام ابن بطال [۱۴]، امام ابن المنذر [۱۵]، امام ابن تیمیہ [۱۶]، امام ابن القیم [۱۷]، امام النووی [۱۸]، امام ابن حجر العسقلانی [۱۹]، امام طیبی [۲۰]، امام ابن القطان [۲۱]، امام الرملی [۲۲]، امام محمد بن عبد الوہاب رحمہم اللہ اجمعین [۲۳]۔

---

(۱) شرح أصول اعتقاد أہل السنۃ والجماعۃ للالکائی: (۱۹۷/۱)۔

(۲) أیضا.

(۳) أیضا.

(۴) شرح أصول اعتقاد أہل السنۃ والجماعۃ: (۱۸۵/۱)۔

(۵) ناسخ الحدیث ومنسوخہ: (ص: ۲۵۷).

(۶) شرح السنۃ للمزنی: (ص: ۴۸ و ۸۹)۔

(۷) العقیدۃ الطحاویۃ: (ص: ۲۰۹)۔

(۸) اعتقاد أہل السنۃ للإسماعیلی: (ص: ۱۸۹ و ۱۹۷)۔

(۹) عقیدۃ السلف أصحاب الحدیث للصابونی: (ص: ۶۸)۔

(۱۰) الشرح والإبانۃ لابن بطۃ: (ص: ۲۷۵ و ۲۷۶)۔

(۱۱) حادی الأرواح إلی بلاد الأفراح لابن القیم: (ص: ۴۱۱)۔

(۱۲) التمہید لابن عبد البر: (۲۷۹/۲۳)۔

(۱۳) الإبانۃ عن أصول الدیانۃ لأبی الحسن الأشعری: (ص: ۷ و ۱۱)۔ مقالات الإسلامیین واختلاف المصلین: (ص: ۲۹۰ و ۲۹۵)۔

(۱۴) شرح ابن بطال علی صحیح البخاری: (۱۶۸/۹) و (۷/۱۹)۔

(۱۵) فتح الباری شرح صحیح البخاری لابن حجر: (۱۲۴/۵)۔

(۱۶) مجموع الفتاوی لابن تیمیۃ: (۴۴۴/۴)۔ منہاج السنۃ النبویۃ لابن تیمیۃ: (۵۲۹/۴)۔

(۱۷) حادی الأرواح إلی بلاد الأفراح لابن القیم: (ص: ۴۱۱)۔

(۱۸) شرح النووی علی صحیح مسلم: (۲۹۹/۱۲)۔

(۱۹) تہذیب التہذیب: (۲۸۸/۲)۔

(۲۰) الکاشف عن حقائق السنن: (۱۸۱/۷-۱۸۲)۔

(۲۱) الإقناع فی مسائل الإجماع لابن القطان: (۶۱/۱)۔

(۲۲) غایۃ البیان شرح زید ابن رسلان: (ص: ۱۵)۔

(۲۳) الدرر السنیۃ فی الأجوبۃ النجدیۃ: (۹۳۲/۷)۔ (تفصیل کے لئے دیکھیں: إجماع العلماء علی تحریم الخروج علی الحاکم المسلم).

الولاءوالبراء کا صحیح معنی ومفہوم (قسط ثانی)

عبد اللہ عبد الرشید مدنی
فاضل جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ

گزشتہ قسط میں ولاءوبراء کا معنی ومفہوم، قرآن وحدیث کی روشنی میں ان کا حکم اوران کی اہمیت کو واضح کیا گیا۔ نیز اس باب میں تساہل برتنے کا نتیجہ، متساہل قسم کے لوگوں کی اقسام اور ولاءوبراء کی اقسام کو بالتفصیل بیان کیا گیا۔ اب آگے ملاحظہ فرمائیں:

ولاءاور براء کی بنیاد پر لوگوں کے اقسام اور انکے ساتھ تعامل کا صحیح اسلامی طریقہ:

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں: "مدح وذم، محبت وبغض اور موالات ومعادات صرف انہیں سے کی جائے گی جن کے متعلق اللہ تبارک وتعالی نے اپنی دلیلیں نازل کی ہیں۔ لہذا مومنوں کے ساتھ موالات قائم کرنا واجب ہے خواہ وہ کسی بھی قسم کے ہوں اور ہر کافر سے بغض رکھنا واجب ہے خواہ وہ کسی بھی قسم کا ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ , وَمَنْ يَتَوَلَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا فَإِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ۔[1] (مسلمانو) تمہارا دوست خود اللہ ہے اور اسکا رسول ہے اور ایمان والے ہیں جو نمازوں کی پابندی کرتے ہیں اور زکاۃ ادا کرتے ہیں اور وہ رکوع (خشوع وخضوع) کرنے والے ہیں، اور جو شخص اللہ تعالی سے اوراسکے رسول سے اور مسلمانوں سے دوستی کرے وہ یقین جانے کہ اللہ تعالی کی جماعت ہی غالب رہے گی۔

نیز فرمایا: وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ[2] (مومن مرد وعورت آپس میں ایک دوسرے کے (مددگار ومعاون) دوست ہیں، وہ بھلائیوں کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں، نمازوں کو پابندی سے بجالاتے ہیں، زکاۃ ادا کرتے ہیں، اللہ اور اسکے رسول کی بات مانتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن پر اللہ تعالی بہت جلد رحم فرمائے گا، بیشک اللہ غلبے والا حکمت والا ہے)۔

شیخ الاسلام فرماتے ہیں: جس (مسلمان) میں ایمان بھی ہو اور فسق وفجور بھی تو اسکے ساتھ اسکے ایمان کے بقدر موالات قائم کی جائے گی اور اسکے فسق وفجور کے بقدر اس سے بغض رکھا جائے گا، کیونکہ (کوئی بھی مسلمان) فقط گناہوں کی بنیاد

---

(۱) سورۃ المائدۃ: (۵۵،۵۶)

(۲) سورۃ التوبۃ: (۷۱)

پر ایمان سے بالکلیہ خارج نہیں ہو جاتا جیسا کہ خوارج و معتزلہ کا عقیدہ ہے۔ اور نا ہی ایمان و دین، محبت و بغض اور موالات و معادات میں انبیاء و صدیقین اور شہداء و صالحین کو مسلمانوں کے فاسق و فاجر لوگوں کی طرح قرار دیا جائے گا، جیسا کہ (فاسق مومنوں کے متعلق) اللہ تعالی کا فرمان ہے: وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ فَإِنْ فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ , إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ۔[1] (اور اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں میل ملاپ کرا دیا کرو۔ پھر ان دونوں میں سے ایک جماعت دوسری جماعت پر زیادتی کرے تو تم (سب) اس گروہ سے جو زیادتی کرتا ہے لڑو۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔ اگر لوٹ آئے تو پھر انصاف کے ساتھ صلح کرا دو اور عدل کرو، بیشک اللہ تعالی انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ (یاد رکھو) سارے مسلمان بھائی بھائی ہیں پس اپنے دو بھائیوں میں ملاپ کرا دیا کرو، اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تم پر رحم کیا جائے)۔ یہاں قتال اور بغاوت کے باوجود اللہ نے ان سب کو آپس میں بھائی بھائی قرار دیا ہے۔"[2]

شیخ الاسلام رحمہ اللہ ایک مقام پر لکھتے ہیں: "اور اسی بنیاد پر سلف صالحین آپس میں جنگ و جدال کے باوجود دین کی بنیاد پر ایک دوسرے سے محبت و موالات قائم رکھتے تھے اور کفار کی دشمنی کی طرح (ان مسلمان بھائیوں سے) دشمنی نہیں رکھتے تھے۔ لہذا (دین کی بنیاد پر) لڑائی جھگڑے کے باوجود آپس میں شہادتیں قبول کرتے، ایک دوسرے سے علم حاصل کیا کرتے، ایک دوسرے کے وارث بنتے، آپس میں شادی بیاہ کا معاملہ کرتے اور آپس میں مسلمانوں جیسا معاملہ رکھا کرتے تھے۔[3]

شیخ صالح الفوزان اور شیخ سلیمان الرحیلی حفظھما اللہ جیسے دیگر اساطین علم نے شیخ الاسلام کی اس وضاحت کی روشنی میں اس باب میں لوگوں کو تین خانوں میں تقسیم کیا ہے۔[4]

پہلی قسم: وہ لوگ جن سے خالص محبت رکھی جائے گی۔ اسکے حق دار خالص و کامل ایمان والے مومنین ہیں۔ ان میں سر فہرست نبی آخر الزماں جناب محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ پھر انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام پھر صحابہ رضی اللہ عنھم اجمعین، اور تمام صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں۔

---

(۱) سورۃ الحجرات: (۹،۱۰)

(۲) مجموع الفتاوی: (۲۸/۲۲۹،۲۲۸)

(۳) مجموع الفتاوی: (۳/۲۸۵)

(۴) الارشاد الی صحیح الاعتقاد: (۳۱۷)

دوسری قسم: وہ لوگ جن سے خالص بغض وعداوت رکھی جائے گی۔ یہ حقیقی کفار، منافقین، مشرکین، مرتدین اور ملحدین وغیرہ ہیں۔

بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب کوئی مومن انکے کسی قریبی (جیسے والد وغیرہ) کو برا بھلا کہہ دیتا ہے یا کوئی الزام لگا دیتا ہے تو وہ اپنے اس مومن بھائی سے بھی بغض وعداوت رکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ لہذا سوچنے کا مقام ہے کہ ایک مومن بھلا کسی ایسے شخص سے دوستی اور محبت کیسے رکھ سکتا ہے جو اس مبارک ہستی پر جھوٹا الزام لگاتا ہو جس پر ہمارے والدین اور ہماری ہزار جانیں قربان ہیں!

در حقیقت کفار نبی اکرم ﷺ پر جھوٹا الزام ہی لگاتے ہیں کیونکہ جس نے اللہ کے رسول ﷺ کے متعلق سنا اور آپ پر ایمان نہیں لایا تو در حقیقت وہ آپ ﷺ کو دعویٰ نبوت میں جھٹلانے والا ہی ہے۔

تیسری قسم: وہ لوگ جن سے ایک ناحیہ سے محبت کی جائے گی اور ایک ناحیہ سے بغض رکھا جائے گا۔ یہ مومنوں میں عاصی اور فاسق قسم کے لوگ ہیں۔ لہذا ایسے لوگوں سے ان کے ایمان کی وجہ سے محبت کی جائے گی اور ان سے ان گناہوں کی وجہ سے جو انہیں اسلام سے خارج نہیں کرتے، بغض وعداوت رکھی جائے گی۔ نیز ان سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے گناہوں کی وجہ سے ان پر نکیر کی جائے، انہیں نصیحت کی جائے، ان پر شرعی حدود قائم کی جائیں اور تعزیری سزائیں دی جائیں تاکہ وہ ان گناہوں سے باز آجائیں (شرعی حدود اور تعزیرات کا حق صرف شرعی حاکم کو حاصل ہے)۔ کیونکہ خوارج کی طرح مرتکب کبیرہ کو کافر قرار دے کر ان سے خالص بغض رکھنا اور ان سے مکمل براءت کا اعلان کرنا کھلی گمراہی ہے۔ اور مرجئہ کی طرح انکے گناہوں کو نظر انداز کر کے، یہ کہتے ہوئے کہ ایمان تو دل میں ہوتا ہے، ان سے خالص محبت رکھنا بھی ضلالت ہے۔

یہاں تیسرے قسم کے لوگوں کے متعلق تھوڑی تفصیل ہے۔ جہاں تک دل کی بات ہے تو دل میں ان کے لئے انکے اعمال کے اعتبار سے محبت یا بغض رکھا جائے گا۔ یعنی بظاہر اگر انکی نیکیاں زیادہ ہیں اور گناہ کم، تو محبت بغض پر غالب رہے گی۔ اور اگر گناہ زیادہ ہیں اور نیکیاں کم، تو بغض محبت پر غالب رہے گا۔ اور جہاں تک تعلقات استوار کرنے کا مسئلہ ہے تو اسکی دو صورتیں ہیں:

پہلی صورت: کسی شخص کی ذات سے محبت یا نفرت کا اظہار کرنا۔

شیخ محترم سلیمان الرحیلی حفظہ اللہ نے "الأصول الثلاثة" کی شرح کرتے وقت اس معاملے میں بہت عمدہ تفصیل پیش کی ہے۔ صوتی شکل میں شیخ کا درس انٹرنیٹ پر موجود ہے اور اسکو تحریری قالب میں بھی ڈھالا گیا ہے. **خلاصہ ملاحظہ فرمائیں:**

کسی شخص کی ذات سے محبت یا نفرت کے اظہار کرنے میں دو چیزوں کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے:

1۔ **اسکے** ظاہری اعمال کا اعتبار کرنا۔

یعنی اگر نیکیاں زیادہ ہوں تو دوستی کا پلڑا بھاری رہے گا اور اگر گناہ و معصیت زیادہ ہوں تو دشمنی کا پلڑا بھاری رہے گا۔ مثلا اگر کوئی فقیر قسم کا مسلمان چوری کرے تو اس پر حد نافذ کرتے ہوئے اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا لیکن اسکی فقیری و محتاجی کی بنیاد پر اسکو زکاۃ بھی دی جائے گی۔

2۔ **دوسری** اہم چیز یہ کہ اس کے ساتھ برتاؤ کرنے میں شرعی مصلحت کو ملحوظ خاطر رکھا جائے گا۔ اور شرعی مصلحت سے کُل چار چیزوں کی مصلحت مراد ہے۔

۱۔ **دین کی مصلحت:** یعنی دیکھا جائے گا کہ دین و شریعت کی رُو سے اس سے کیسا برتاؤ رکھنا زیادہ بہتر ہے۔ مثلا اگر کوئی خراب قسم کا بدعتی ہو لیکن اسکی بدعت کفریہ نہ ہو تو اس سے براءت کا اظہار زیادہ بہتر ہے۔

۲۔ **برتاؤ کرنے والے کی اپنی مصلحت:** یعنی اگر اُس عاصی مسلمان سے ملنا جُلنا ہمارے لئے مُضِر اور ہمارے ایمان و عمل کیلئے پُر خطر ہو تو اس سے محبت کا اظہار نہیں کیا جائے گا۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو اس کے ساتھ تعلق استوار کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن دیگر مصلحتوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے جن کا بیان ذیل میں آرہا ہے۔

۳۔ **اس عاصی مسلمان کی مصلحت:** یعنی اگر اسکے ساتھ محبت و مودت کا اظہار اسکے لئے زیادہ بہتر ہے اور ممکن ہے جب اسکے گنہگار ہونے کے باوجود اس سے محبت کا اظہار کیا جائے تو وہ شرم وعار محسوس کرے اور گناہوں سے توبہ کرلے تو ایسی صورت میں اس سے محبت و دوستی قائم کی جائے گی۔ اور اگر معاملہ برعکس ہو، یعنی اگر اس سے لاتعلقی برتی جائے تب ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگا تو ایسی صورت میں اس سے بیزاری ظاہر کی جائے گی۔ یاد رہے کہ مذکورہ بالا تینوں صورتوں میں اسکی اصلاح مقصود ہے۔

۴۔ **مسلمانوں کی مصلحت:** یعنی اگر اس شخص سے محبت و دوستی کے اظہار کی وجہ سے عمومی طور پر مسلمان غلط فہمی کے شکار ہو کر اسے اور اسکی گمراہیوں کو اچھا سمجھنے لگیں گے اور وہ بھی ان بداعمالیوں کے مرتکب ہونے لگیں گے تو ایسی صورت میں اس شخص سے براءت وبیزاری کا اظہار کیا جائے گا۔ اور اگر مسلمانوں کی بہتری اس میں ہو کہ اس شخص سے محبت و مودت کا اظہار کیا جائے تاکہ کوئی فتنہ نہ برپا ہو جائے تو ایسا ہی کیا جائے گا۔

لیکن یاد رہے کہ ان تمام مصلحتوں کو بیک وقت ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ہی یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ اس شخص کے ساتھ کیسا تعلق رکھنا ہے۔

دوسری صورت: بسا اوقات انسان کی ذات سے براءت کا اعلان نہیں کیا جاتا بلکہ اسکے فعل سے براءت کا اعلان کیا جاتا ہے۔ یہ اس وقت جب کسی مومن سے کوئی حرام امر کا صدور ہو جائے لیکن کوئی شرعی مانع (رکاوٹ) بھی موجود ہو جو اس سے براءت کرنے سے روکتی ہو۔ جیسے کسی سے اجتہادی غلطی سرزد ہو جائے تو ایسی صورت میں اس کے اس فعل سے براءت کیا جائے گا نا کہ فاعل سے کیونکہ فاعل گنہگار ہی نہیں ہے۔ اسکی دلیل یہ روایت ہے: "ابن عمر رضی اللہ عنھما بیان کرتے ہیں

کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو بنی جذیمہ کی طرف بھیجا۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے انہیں اسلام کی دعوت دی لیکن انہیں «أسلمنا۔» "ہم اسلام لائے" کہنا نہیں آتا تھا، اس کے بجائے وہ «صبأنا۔، صبأنا۔» "ہم نے دین بدل دیا، یعنی اپنے آبائی دین سے ہٹ گئے" کہنے لگے۔ خالد رضی اللہ عنہ نے انہیں قتل کرنا اور قید کرنا شروع کر دیا اور پھر ہم میں سے ہر شخص کو اس کا قیدی اس کی حفاظت کے لیے دے دیا پھر جب ایک دن خالد رضی اللہ عنہ نے ہم سب کو حکم دیا کہ ہم اپنے قیدیوں کو قتل کر دیں۔ میں نے کہا: اللہ کی قسم! میں اپنے قیدی کو قتل نہیں کروں گا اور نہ میرے ساتھیوں میں کوئی اپنے قیدی کو قتل کرے گا۔ بالآخر جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے صورت حال بیان کیا تو آپ نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی۔ اے اللہ! میں اس فعل سے بیزاری کا اعلان کرتا ہوں، جو خالد نے کیا۔ دو مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فرمایا۔[1]

ابن حجر رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں: اس حدیث کا ظاہری معنی یہ ہے کہ فعل کے براءت سے فاعل کا گنہگار ہونا لازم نہیں آتا اور نہ اس پر سزا کا نفاذ لازم آتا ہے کیونکہ یہاں فاعل گنہگار نہیں ہے گرچہ اس کا فعل ممدوح نہیں ہے۔[2]

اسی طرح حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے بھی (السیر ۱/ ۳۷۱) میں اسے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی اجتہادی خطا قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اسی وجہ سے نبی اکرم ﷺ نے ان سے دیتوں کا مطالبہ نہیں کیا۔

---

(۱) صحیح البخاری: (۴۳۳۹)

(۲) الفتح: (۱۸۲/۱۳)

قرآن مجید کی لغوی تفسیر: مفہوم وضوابط (قسط ثانی)

حافظ فیضان عالم
جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ

گزشتہ سطور میں مذکور اسباب کے علاوہ اہل باطل نے مزعومہ اعتقادات کو اساس فراہم کرنے کے لئے لغت اور کلام عرب کی وسعت کو ایک ہتھکنڈے کے طور پر برتا، جس کے لیے بنیادی طور پر اسلوب کلام، ذو معنی الفاظ، اور کلمے کی ہیئت وساخت کا سہارا لیا گیا۔ بایں طور کہ اگر آیت کا لفظ ذو معنی ہو، جس کا ایک معنی ان کے مذہب کی تائید میں ہو، تو وہاں وہ معنی کا اختیار لازم ٹھہرے گا. جو ان کے مذہب کی تائید میں وارد ہوا ہو، قطع نظر اس سے کہ قرآنی سیاق اس کے متحمل ہے یا نہیں، اسی طرح اسلوب کلام کی رو سے اگر کلام کو حقیقت پر محمول کرنے سے ان کے مذہب پر زد پڑتا ہو تو کلام کی تاویل کی جائے گی اور اسے مجازی قرار دیا جائے گا۔ متذکرہ صورتوں کی توضیح کے لئے ذیل کے سطور ملاحظہ فرمائیں:

اسلوب کلام کی مثال: اللہ تعالیٰ کا قول ہے: وجاء ربک والملک صفا صفا.[1]

اہل تاویل اس آیت کے متعلق کہتے ہیں کہ یہاں آیت میں حذف واقع ہے، وہ اس طور سے کہ "رب" مضاف الیہ ہے، اور اس کا مضاف محذوف ہے، اور آیت کا معنی یوں ہے: وجاء أمر ربک بالمحاسبة والجزاء" حالانکہ کلام میں حذف ماننے کے متعلق اہل علم کہتے ہیں: کلام میں حذف وہاں تسلیم کیا جاتا ہے جہاں مقام حذف کا متقاضی ہو۔ لیکن یہاں آیت میں حذف کی کوئی گنجائش نہیں، اس کے باوجود حذف تسلیم کرنے پر ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا جاتا ہے، کیونکہ آیت کے حقیقی معنی کے اثبات سے ان کے زعم کے مطابق باری تعالیٰ کے حق میں تجسیم لازم آئے گا۔ جبکہ سلف کے نزدیک اس آیت کا سادہ اور حقیقی معنی یہ ہے کہ اس دن رب کا نزول ہوگا اور فرشتے صف بہ صف کھڑے ہوں گے۔

ذو معنی لفظ کی مثال: عربی زبان میں ایک لفظ کئی معانی میں مستعمل ہوتا ہے، جیسے لفظ "ید" بیک وقت ہاتھ، قدرت، نعمت اور نصرت کے معانی پر دلالت کرتا ہے، اگر اس طرح کے الفاظ کا ورود کہیں ہوتا ہے تو اس کا ضابطہ یہ ہے کہ اس کے معنی کا اطلاق سیاق طے کرتا ہے، یا دیگر قرائن کی مدد سے معنی مراد حاصل کیا جاتا ہے، اہل باطل کی روش یہ ہے کہ وہ اس موقع پر وہ معنی اختیار کرتے ہیں جو ان کے مذہب کے موافق ٹھہرتا ہو۔ صرف اس بنیاد پر کہ کلام عرب میں لفظ کا وہ معنی بھی مستعمل ہے، خواہ سیاق کلام اس امر سے مانع کیوں نہ ہو۔ اسے ذیل کی مثال سے سمجھا جاسکتا ہے:

ابن قتیبہ رحمہ اللہ (م۲۷۶) بعض اہل تاویل کے حوالے سے ذکر کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے معتقدات کے اثبات میں قرآن مجید کی عجیب وغریب تفسیر کرنے کی ناروا کوشش کی ہے، بطور مثال آیت "واتخذ الله إبراهيم خليلا"[1] میں وراد لفظ

---

(۱) سورۃ الفجر: ۲۲۔

"خلیل" کا معنی وہ "فقیر" (محتاج) بیان کرتے ہیں، ان کا ماننا ہے کہ لفظ خلیل یہاں "الخلة" - خا کے زبر کے ساتھ - سے مشتق ہے، بطور استشہاد وہ زہیر بن ابی سلمی کا یہ شعر نقل کرتے ہیں:

وإن أتاه خليل يوم مسألة

يقول: لا غائب مالي ولا حرم

یعنی: اگر فقیر آئے۔

آپ غور فرمائیں اگر خلیل کا معنی فقیر سے کیا جائے تو کیا اس سے کسی طور پر ابراہیم علیہ السلام کی فضلیت ثابت ہو گی؟ کیا ہر مخلوق اللہ کے سامنے فقیر و محتاج نہیں؟ لہذا جس طرح قرآن نے موسی علیہ السلام کو "کلیم اللہ" سے خطاب کیا، عیسی علیہ السلام کو "روح اللہ" سے مخاطب فرمایا، اسی طور پر ابراہیم علیہ السلام کو یہاں "خلیل اللہ" کہا گیا۔[۲]

"الخُلّة" کے معنی کمال محبت کے ہیں، جبکہ "الخَلّة" فقر کے معنی کے لئے آتا ہے، آیت میں خلت یعنی کمال محبت ہی مراد ہے، یہاں فقر معنی لینے کی کوئی گنجائش نہیں، لیکن انہوں نے اس لفظ کی بے جا تاویل کی، کیونکہ ان فکر کے مطابق اللہ کو یہ صفت زیب نہیں دیتا۔ جبکہ قرآن بصراحت اس امر پر دلالت کر رہا ہے۔

اس طرح کے کئی حربے اور متنوع مثالیں ان کی تفسیر کی کتابوں میں بھری پڑی ہیں، اگر بغور دیکھا جائے ان کا یہ رویہ بالخصوص تین امور کے ارد گرد گھومتا ہے۔ اگر آیت مندرجہ ذیل امور سے متعلق ہو گا تو وہاں مذکورہ نوعیت کی تاویل ضرور بالضرور دیکھنے کو ملے گی:

۱) آیت کا تعلق توحید اسماوصفات سے ہو۔

۲) آیت کا تعلق غیبی امور سے ہو، یعنی وہ امور جن کا تعلق یوم آخرت سے ہو، یا بعض غیبی مخلوقات کے کسی مخصوص احوال سے باخبر کیا جارہا ہو، یا جمادات کے تئیں کسی مخصوص صفت کی نسبت کی جارہی ہو، جس کا ادراک عقل انسانی کے لئے محال ہو۔

۳) آیت کا تعلق انبیا علیہم السلام کی عصمت اور پاکیزگی سے ہو۔

انہی انحرافات اور بے جا تاویلات کے پیش نظر اہل علم نے لغوی تفسیر کی بابت چند ضوابط مقرر فرمائے ہیں، جس کی پاسداری ایک مفسر کے لیے از حد ضروری ہے۔ تاکہ لغت اور کلام عرب کی وسعت اور اسالیب کے نام پر قرآن مجید کی غلط تفسیر سے بچا جاسکے۔ ذیل میں چند ضوابط رقم کیے جارہیں:

---

(۱) سورۃ النساء: ۱۲۵۔

(۲) تاویل مختلف الحدیث: (ص/۸۳)۔

۱)اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو کلام عرب کے اسلوب میں نازل فرمایا ہے، لہذا قرآن کے تمام الفاظ واسالیب عربی ہیں، لیکن قرآن میں تمام کلام عرب کا احاطہ نہیں، بنابریں کلام عرب اور قرآن مجید میں عموم و خصوص مطلق کی نسبت ہے۔

۲)قرآن مجید کسی خاص قبیلے کی لغت پر نازل ہوا، اور نہ ہی عرب کی تمام قبائل کی زبان میں نازل ہوا، بلکہ قرآن مجید کا نزول بعض اہل عرب کی لغت پر ہوا ہے۔

۳)لغت کی تحقیق دو طریقے سے انجام پاتی ہے، سماع اور قیاس۔ لہذا جو لغت سماع اور قیاس سے ثابت نہیں، اسے کلام عرب میں نہیں شمار کیا جائے گا۔ نیز لغوی سماع کے تین مصادر ہیں:

قرآن مجید: لغوی سماع کے باب میں قرآن مجید کا مقام سب سے اعلی وارفع ہے، نیز قرآن مجید اپنی تمام مشہور اور شاذ قرآت کے ساتھ اہل لغت کے نزدیک حجت ہے۔[1]

حدیث نبوی: لغوی احتجاج کی بابت قرآن مجید کے بعد اس کا دوسرا مقام ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فصاحت وبلاغت کی رو سے تمام اہل عرب سے فائق تھے، اور اہل لغت نے حدیث نبوی کو بطور حجت تسلیم کیا ہے، ابن الطیب الفاسی (۱۱۷۰) نے اس پر اہل لغت کا عملی اجماع نقل فرمایا ہے۔[2]

کلام عرب: یہ لغت کا سب سے وسیع مصدر ہے، جو کہ شعر اور نثر تمام کو محیط ہے، استشہاد کے لیے شاعر/کاتب کا فصیح اللسان ہونا ضروری ہے، اہل لغت نے ان قبائل اور افراد کی تعیین کی ہے، جس کی لغت بطور حجت تسلیم کی جاتی ہے نیز ان کے زمان ومکان کی بھی تحدید فرمائی ہے۔

۴)اگر کسی لفظ کے متعلق لغت میں ایک سے زائد معانی کا بیان ہو، تو ایسی صورت میں لفظ کا جو معنی مشہور ہو، اسے اختیار کیا جائے گا، شاذ اور قلیل استعمال معنی کی طرف التفات نہیں کیا جائے گا۔

۵)لغوی معنی کی تعیین میں سیاق کی رعایت لازمی ہے، لہذا سیاق کی مناسبت سے جو معنی متعین ہو، اسے ترجیح دیا جانا چاہیے۔

۶)لغوی تفسیر کے لئے ضروری ہے کہ مفسر آیت کے شان نزول سے واقف ہو، تاکہ لفظ کے معنی میں کسی طور کا کوئی ابہام نہ رہے۔

۷)لفظ کے شرعی اور لغوی معنی کے تعارض کی صورت میں شرعی معنی مقدم کیا جائے گا، کیونکہ قرآن کے نزول کا اساسی مقصد شریعت کی توضیح کے ہے، نہ کہ لغت کا بیان۔

واضح رہے کہ اہل علم نے یہ ضوابط کلام سلف کے استقرائی مطالعے کے نتیجے میں وضع کیا ہے۔ (ختم شد)۔

---

(۱)الاقتراح فی اصول النحو: ۱/۴۱۶۔

(۲)شرح کفایۃ المتحفظ: ص ۱۰۰۔

اہل بدعت سے علم حاصل کرنے اور ان کی تقریر وغیرہ سننے کے تعلق سے سلف صالحین کا منہج (قسط ثانی)

مامون رشید بن ہارون رشید سلفی
جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ

سلف صالحین کا اس امت پر احسان ہے کہ انہوں اسلام کے نام پر رونما ہونے والے تمام فتنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور علمی طور پر ان کے دلائل کے تار و پود بکھیرے، شرک کے بعد اسلام میں دوسرا بڑا فتنہ بدعت کا ہے، جس سے نبی اکرم ﷺ نے اپنے اصحاب کو خصوصا تحذیر کی، اہل بدعت سے تحذیر کی یہی روش آپ ﷺ کی وفات کے بعد آپ کے اصحاب کرام نے بھی اختیار کی اور اہل بدعت کی مجالست، ان سے استفادہ اور ان کی کتابوں کے پڑھنے سے متفقہ طور پر منع کیا۔ سلف صالحین کے یہاں اس مسئلے میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہ تھا۔ فی زمانہ ہمیں سلفی نسبت رکھنے والے ایسے افراد سے واسطہ پڑ رہا ہے جنہوں سلف کے اس اجماعی موقف سے اختلاف ہے اور وقتا فوقتا انہیں اپنی تنقید کا نشانہ بناتے رہتے ہیں۔ قسط سابق میں یہ بات آئی کہ بعض صحیح المنہج لوگوں جب اہل بدعت سے قربت اختیار کی اور ان کی کتابوں سے علم لینا شروع کیا تو کس طرح راہ حق سے انحراف کے شکار ہو گئے۔۔۔۔۔۔ اب آگے پڑھیں: (ادارہ)۔

اس کے برعکس بہت سارے منحرفین اور بدعتیوں نے جب اہل السنہ والجماعہ کی مجالست اختیار کی، اہل الحدیث سے علم حاصل کیا اور سلفیوں کی کتابوں کا مطالعہ کیا تو اپنے باطل افکار و نظریات سے تائب ہو کر خالص دین اور منہج سلف صالحین کی طرف لوٹ آئے، اور طائفہ ناجیہ منصورہ میں شامل ہو کر دنیا و آخرت میں فلاح و بہبود کا راستہ ہموار کر لیا، اس کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

علامہ ابن شیخ الحزامیین عماد الدین الواسطی رحمہ اللہ صوفیاء کے "طریقہ احمدیہ" کے پیر و مرشد تھے، البتہ آپ میں بچپن ہی سے قبول حق کا جذبہ موجود تھا، چنانچہ اسکندریہ میں جب صوفی فرقہ "شاذلیہ" کے کچھ لوگوں سے آپ کی ملاقات ہوئی اور آپ نے ان کی صحبت میں وقت گزارا تو اسی کے پیروکار بن گئے، حتیٰ کہ دمشق میں آپ کی ملاقات شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے ہوئی، آپ ان کے دروس میں حاضر ہوئے اور ان کی باتوں کو سنا، اور ان کی نصیحتوں پر عمل کرتے ہوئے کتبِ

سیرتِ نبویہ کا مطالعہ شروع کیا تو بدعات وخرافات سے تائب ہو کر خود اہل بدعت کے سخت مخالف بن گئے اور متعدد کتابیں لکھ کر اہل حق کی تائید کی اور بدعتیوں کو سخت تنقیدوں کا نشانہ بنایا۔ (۱)

علامہ احمد بن محمد بن مرّی البعلی (متوفی ۷۳۰ھ) رحمہ اللہ اپنے ابتدائی دور میں منہج سلف صالحین سے دور اور راہ راست سے بھٹکے ہوئے تھے اور امام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ کے سخت مخالف اور حریف تھے، لیکن جب آپ سے ملے تو آپ کے گرویدہ ہو کر رہ گئے، آپ سے بے انتہا محبت کرنے لگے، پھر آپ کی شاگردی اختیار کر لی اور آپ کی کتابوں کو اپنے ہاتھوں سے لکھا، یہاں تک کہ مبالغہ کی حد تک آپ کا دفاع کرنے لگے، چنانچہ آپ کے پاس زانوئے تلمذتہ کرنے کے بعد جب قاہرہ لوٹے تو امام ابن تیمیہ کی طرح صوفیوں کے خلاف شمشیر براں بن گئے، پھر کیا تھا بدعتیوں نے آپ کے خلاف ہلہ بول دیا اور آپ کو قتل کرنا چاہا، لیکن آپ کسی طرح جان بچا کر نکلنے میں کامیاب ہوئے، اس کے بعد بھی دشمنوں نے پیچھا نہیں چھوڑا اور سلطان سے شکایت لگادی، پھر سلطان کے حکم سے آپ کو پسِ دیوارِ زنداں ڈال دیا گیا اور آپ پر مختلف قسم کے مظالم ڈھائے گئے۔ (۲)

امام ابن القیم رحمہ اللہ جیسے عبقری انسان ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے ملاقات کرنے اور آپ کی شاگردی اختیار کرنے سے قبل اشاعرہ جہمیہ اور معطلہ کی طرح صفات باری تعالیٰ کا انکار اور تاویل کرتے تھے اور انہیں کی طرح شبہات میں مبتلا تھے، لیکن جب امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے علم حاصل کرنا شروع کیا تو آپ کے سارے شبہات دور ہو گئے اور منہج سلف کے عظیم داعی بن کر ابھرے۔ (۳)

علامہ رشید رضا مصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ جب علم کلام میں غور وخوض کرنے میں مشغول تھے، تو اپنی کتابوں میں حنابلہ (بعض حضرات اہل السنہ والجماعہ کو حنابلہ سے موسوم کرتے ہیں، مراد عقائد میں امام احمد کے منہج پر چلنے والے لوگ ہیں) کی مخالفت دیکھتے اور سمجھتے تھے کہ یہ لوگ نصوص شرعیہ کے ظاہر پر جمود اختیار کر بیٹھے ہیں، انہوں نے نصوص کو صحیح سے سمجھا نہیں ہے اور نہ ہی علوم کے حقائق سے آگاہ ہوئے ہیں کہ نصوصِ شرعیہ اور حقائقِ علوم کے مابین باہم مطابقت پیدا کرتے، اور یہ گمان کرتے تھے کہ صرف اشاعرہ کی کتابیں ہی دین کا سرچشمہ اور یقین کا راستہ ہیں، لیکن جب ان کی

---

(۱) (معجم أصحاب شیخ الإسلام ابن تیمیۃ ص: ۳۳-۳۴، نیز مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ نے "تذکرہ" کے اندر بالتفصیل آپ کے قبول حق اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ سے متاثر ہونے کا تذکرہ فرمایا ہے۔)

(۲) (تفصیل کے لئے دیکھئے: الدرر الکامنۃ لابن حجر ۱/۳۵۸)۔

(۳) (نونیۃ ابن القیم "الکافیۃ الشافیۃ" ص: ۱۴۳)۔

کتابوں کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ یہی وہ کتابیں ہیں جو مسلمانوں کے لئے سلف صالحین کی بے مثال شاہراہوں کو روشن کرتی ہیں اور انہیں صحیح منزل تک پہنچاتی ہیں....![1]

علامہ علی الطنطاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:"ہمارے یہاں دمشق میں وہابیت ایک خطرناک اور سنگین جرم اور تہمت سمجھی جاتی تھی، اور لوگ ہمیں ان (وہابیوں) کے ساتھ مل بیٹھنے سے ڈراتے تھے کہ ایک بار مجھے معروف حنبلی عالم ابن بدران کی مجلس میں حاضر ہونے کا اتفاق ہوا، وہاں کچھ طلبہ بازار سے گزر رہے تھے تو انہوں نے مجھے ابن بدران کی مجلس میں دیکھ لیا، اور میرے تعلق سے ایک رپورٹ لکھ کر مشائخ کی خدمت میں پیش کر دی، چنانچہ میرے پیروں میں ڈنڈے سے مارا گیا۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں عقائد میں اشاعرہ وماتریدیہ کے منہج پر تھا، جو توحید کے اثبات میں کسی نہ کسی طور پر یونانی فلسفہ کا سہارا لیتے ہیں، اور میں اسی منہج کا معتقد تھا جو انہوں نے مجھے سکھایا تھا کہ توحید اسماء وصفات کے باب میں سلف کا طریقہ اسلم ہے اور خلف کا طریقہ احکم یعنی ٹھوس اور مضبوط ہے.. یہاں تک کہ شیخ بہجت البیطار سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے ہمیں بتایا کہ سلف کا طریقہ ہی اسلم بھی ہے اور احکم بھی.... میں ابن تیمیہ سے شدید نفرت کرتا تھا اور ان کی کتابوں سے دور بھاگتا تھا، بلکہ ان سے بغض رکھتا تھا اور حنفی مذہب کا متعصب قسم کا کٹر مقلد تھا، پھر انہوں نے ابن تیمیہ سے محبت کرنا سکھایا اور حنفی مذہب کے لئے تعصب چھوڑ کر دلیل کی اتباع کی تلقین کی اور اس طرح میں ان کے ساتھ متعدد مجالس میں بیٹھنے، بحث ومباحثہ کرنے اور راتوں کو جاگ جاگ کر علم حاصل کرنے کے بعد ان سے متاثر ہو گیا اور سلفی العقیدہ اور متبع دلیل بن گیا۔[2]

علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:"میں سخت غفلت اور کھلی گمراہی میں تھا، اور میں طریقہ "تیجانیہ" سے خروج کو اسلام سے خروج تصور کرتا تھا، میرے دل میں کبھی خیال تک نہیں آیا تھا کہ میں اس سے بال برابر بھی پیچھے ہٹوں گا، میں کفر وشرک میں مبتلا تھا، پھر میں شیخ محمد بن عربی علوی مراکشی سے ملا، آپ نے مجھے طریقہ تیجانیہ سے توبہ کرنے کو کہا اور دلیل کی اتباع کرنے کی نصیحت کی، میں مسلسل آٹھ دنوں تک آپ سے مناقشہ اور سوال جواب کرتا رہا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ہدایت دی۔[3]

---

(۱)(مجلۃ المنار ۶/۲۲۰)۔

(۲)(علامۃ الشام عبد القادر بن بدران ص:۲۲، رجال من التاریخ ص:۱۷۱،۱۷۲)۔

(۳)(الہدیۃ الہادیۃ ص:۱۲، https://youtu.be/w3uUHoNmuvA)۔

علامہ محمد جمیل زینو رحمہ اللہ تصوف میں غرق تھے، ایک روز آپ اپنے ایک صوفی استاد سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث پڑھ رہے تھے جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "إذا سألتَ فاسألِ الله، وإذا استعنتَ فاستعن بالله" کہ جب کوئی چیز مانگنی ہو تو اللہ سے مانگو اور جب مدد کی ضرورت ہو تو اللہ ہی سے فریاد کرو، اور پھر امام نووی رحمہ اللہ کی اس حدیث کی شرح پڑھ رہے تھے، چنانچہ آپ کو امام نووی کی تشریح بڑی پسند آئی اور آپ نے اپنے استاد سے سوال کیا کہ حدیث اور شرح اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جن چیزوں کی قدرت اللہ کے علاوہ کوئی نہ رکھتا ہو ان چیزوں میں غیر اللہ سے مدد مانگنا جائز نہیں ہے؟ استاد نے کہا کہ نہیں! جائز ہے، آپ نے فرمایا اس کی دلیل کیا ہے؟ تو شیخ غصہ ہو گئے اور چلا اٹھے... اور کہا کہ تمہارے افکار وہابیت زدہ ہیں حالانکہ میں وہابیت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا.... چنانچہ میں نے اپنے دل میں کہا کہ اگر وہابی لوگ صرف اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنے کا عقیدہ رکھتے ہیں، اور اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ شفا دینے والا صرف اللہ ہے تو مجھے ان کے بارے میں جاننا چاہیے!.... اس طرح آپ امام نووی رحمہ اللہ کی شرح سن کر صحیح دین سلفیت کی طرف لوٹ آئے اور عقیدہ صحیحہ پر متعدد کتابیں لکھ کر سلفی دعوت کی عظیم خدمت کی۔ (۱)

محدث مدینہ علامہ حماد الانصاری رحمہ اللہ فرماتے: "میں نے اپنے استاد مؤسس "جماعۃ انصار السنہ المحمدیہ" علامہ محمد حامد الفقی (متوفی ۱۳۸۷ھ) رحمہ اللہ سے سوال کیا کہ: آپ ازہر (مصر) میں پڑھنے کے باوجود موحّد کیسے بن گئے؟ تو شیخ نے فرمایا: پیارے بیٹے اللہ کی قسم تمہارا سوال بڑا مناسب اور شاندار ہے، پھر فرمایا کہ: میں نے جامعہ ازہر میں تعلیم حاصل کی اور متکلمین کا عقیدہ سیکھا جو وہ پڑھاتے ہیں، اور اس طرح گریجویشن کی ڈگری حاصل کر لی، اس کے بعد اپنے وطن کی طرف روانہ ہوا تاکہ لوگ میری کامیابی سے خوش ہوں، کہ راستے میں میرا گزر ایک کسان کے پاس سے ہوا جو کھیت جوت رہا تھا، جب میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے کہا کہ اے میرے بیٹے اس مینڈھ پر بیٹھو، وہاں ایک ٹیلہ نما اونچی زمین تھی، جب وہ کام ختم کر لیتا تو اس پر بیٹھتا تھا، چنانچہ میں مینڈھ پر بیٹھ گیا جبکہ وہ کام کر رہا تھا، اسی دوران مجھے وہاں ایک کتاب ملی، میں نے اسے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ امام ابن القیم کی کتاب "اجتماع الجيوش الإسلامية على غزو المعطلة والجهمية" ہے، پس میں تنہائی دور کرنے کے لئے کتاب پڑھنے لگا، اور جب اس نے دیکھا کہ میں کتاب اٹھا کر پڑھنے لگا ہوں، تو آنے میں تھوڑی تاخیر کر دی تاکہ میں کتاب کے بارے میں مختصر معلومات حاصل کر لوں اور میرے ذہن میں کتاب کا ایک مختصر خاکہ بیٹھ جائے، پھر تھوڑے

(۱) (کیف اہتدیت إلی التوحید والصراط المستقیم لمحمد جمیل زینو ص: ۳۵،۳۶)۔

عرصے کے بعد وہ آیا سلام کیا اور کہا: کیا حال ہے برخوردار؟ کہاں سے آئے ہو؟ میں نے ان کے سوالات کا جواب دیا، تو اس نے مجھے کہا ائے میرے بچے واللہ تم بڑے ذہین ہو؛ کیونکہ تم نے ابتدا سے لے کر اس مرحلہ تک کی تعلیم حاصل کر لی ہے، لیکن ائے میرے بیٹے میں تمہیں ایک وصیت کرنا چاہتا ہوں، میں نے کہا: وہ کیا ہے؟ کسان نے کہا: تمہارے پاس وہ ڈگری ہے جو تمہیں پوری دنیا میں روزگار فراہم کر سکتی ہے، یورپ میں بھی، امریکہ میں بھی ہر جگہ، لیکن اس ڈگری نے تمہیں وہ تعلیم نہیں دی ہے جو تمہیں سب سے پہلے حاصل کرنی تھی، میں نے کہا وہ کیا ہے؟

کسان نے کہا: اس نے تمہیں توحید کی تعلیم نہیں دی ہے۔

میں نے کہا: توحید!!

کسان نے کہا: ہاں سلف صالحین والی توحید.

میں نے کہا: سلف صالحین والی توحید کیا ہے؟!!

اس نے کہا: غور سے سنو! اس کسان نے جو تمہارے سامنے ہے کیسے سلف صالحین والی توحید کا علم حاصل کیا ہے، یہ وہ کتابیں ہیں جو میں نے پڑھی ہے: امام احمد کی کتاب "السنہ" امام ابن خزیمہ کی کتاب "التوحید" امام بخاری کی کتاب "خلق أفعال العباد" امام لالکائی کی کتاب "اعتقاد أهل السنة" اور اس طرح انہوں نے توحید اور عقیدہ کی بہت ساری کتابوں کا ذکر کیا، متاخرین کی تالیفات کا بھی تذکرہ کیا اور اس کے بعد امام ابن تیمیہ اور ابن القیم رحمہا اللہ کی کتابوں کا ذکر کیا۔

اور کہا کہ: میں تمہیں ان کتابوں کو پڑھنے کا مشورہ دیتا ہوں، پس جب تم اپنے گاؤں پہنچ جاؤ، لوگ تمہیں دیکھ لیں اور تمہاری کامیابی پر خوش ہو لیں تو تم وہاں ٹھہر مت جانا، بلکہ جلدی سے قاہرہ لوٹ جانا اور جب وہاں پہنچ جاؤ تو "دار الکتب المصریہ" کے اندر داخل ہونا، وہاں تمہیں یہ ساری کتابیں مل جائیں گی، لیکن وہ بوسیدہ اور غبار آلود ہوں گی تم انہیں صاف کرنا غبار کو جھاڑ کر ان کتابوں کو پڑھنا.... شیخ فرماتے ہیں کہ میں اپنے گھر میں تھوڑا وقت گزارنے کے بعد دوبارہ قاہرہ لوٹ گیا اور مجھے سوائے ایک کے وہ ساری کتابیں مل گئیں، میں نے ان کا مطالعہ کیا اور سلف صالحین کے منہج پر رواں دواں ہو گیا" چنانچہ اس طرح شیخ ایک کسان کے پاس بیٹھنے، ان کی باتیں سننے اور انہوں نے جن کتابوں کا مطالعہ کرنے کا مشورہ دیا تھا انہیں پڑھنے کی وجہ سے راہ

راست اور منہج سلف صالحین کی طرف گامزن ہو گئے، یہاں تک کہ آپ مصر میں منہج سلف صالحین کے سب سے بڑے داعی وناشر اور کتاب وسنت کے سب سے بڑے مدافع بن کر ابھرے۔ (۱)

علامہ عبد الرحمن الوکیل (متوفی ۱۳۹۰ھ) رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "زمانہ آگے بڑھتا گیا یہاں تک کہ میں توحید اور فلسفہ کا طالب علم بن گیا، اور تصوف کا علم حاصل کیا، یہاں تک کہ ایک بار میں نے "رأي ابن تيمية في ابن عربي" نامی ایک کتاب کا مطالعہ کیا جسے میرے کسی استاد نے لکھا تھا، اس وقت میرا دل ذرا ابن تیمیہ کی طرف مائل ہوا، حالانکہ اس سے قبل میں انہیں گمراہ اور گمراہ کن سمجھتا تھا... میرے پاس آپ کی کچھ کتابیں تھیں لیکن میں ان کا مطالعہ کرنے سے ڈرتا تھا اس اندیشہ کے پیش نظر کہ کہیں میں مزعوم اولیاء کے تعلق سے شک میں مبتلا نہ ہو جاؤں، جیسا کہ میرے بعض اساتذہ نے مجھ سے پہلے ہی یہ کہہ رکھا تھا، لیکن اس مرتبہ میں نے ہمت سے کام لیا اور پڑھنے لگا اور اسی میں منہمک ہو کر رہ گیا، تو اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک روشن صبح کا تحفہ دیا جس نے اس رات کے پردوں کو چاک کر دیا جس میں میں محو خواب تھا، چنانچہ مجھے جماعت انصار السنہ المحمدیہ کے پاس جا کر قرار نصیب ہوا... مجھے جماعت کے مؤسس فضیلۃ الوالد شیخ محمد حامد الفقی رحمہ اللہ نے سلف صالحین کے فہم کے مطابق کتاب وسنت کے توسط سے حق اور ہدایت میں غور وفکر کرنے کی دعوت دی تھی۔ (۲)

علامہ محمد امان بن علی الجامی رحمہ اللہ، علامہ محمد خلیل ہراس رحمہ اللہ کی کتاب "شرح العقيدة الواسطية" کی شرح کرتے ہوئے بطور تمہید فرماتے ہیں: یہ رسالہ (العقیدہ الواسطیہ) جس کی ہم شرح کرنے والے ہیں، اس کی شرح ایک ازہری سلفی عالم نے کی ہے، جو جامع ازہر سے فارغ التحصیل اور منطق وفلسفہ کے متخصص ہیں، آپ شیخ الاسلام سے اسی طرح دشمنی کرتے تھے جس طرح ابتدائے اسلام میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام سے دشمنی کرتے تھے، شیخ محمد خلیل ہراس نے جب سنا کہ ابن تیمیہ منطق اور فلسفہ کے دشمن ہیں، تو وہ ابن تیمیہ سے شدید عداوت رکھنے لگے، کیونکہ وہ منطق وفلسفہ کے متخصص تھے، اس وجہ سے آپ نے بعض لوگوں کے مشورے سے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے رد میں پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے کا ارادہ کیا کیونکہ ابن تیمیہ منطق، فلسفہ اور علم کلام کے دشمن تھے، شیخ محمد خلیل ہراس- آپ ہمارے استاد تھے، آپ نے یہ واقعہ بلاواسطہ ڈائریکٹ ہم سے بیان کیا ہے- فرماتے ہیں کہ: جہاں تک ممکن ہو سکا میں نے قاہرہ کے اندر موجود شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی

---

(۱) (المجموع للشيخ حماد الأنصاري ۲۹۴، ۱/۲۹۷)۔

(۲) (مصرع التصوف للشیخ عبد الرحمن الوکیل ۱/۶)۔

کتابوں کو جمع کیا، تاکہ ان کا دراسہ اور ریسرچ کر سکوں اور پھر شیخ الاسلام پر رد کروں، چنانچہ میں تین ماہ تک مسلسل ان کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا، اس کے بعد مجھے پتہ چلا کہ اب تک میں نے اسلام کو نہیں سمجھا تھا، لیکن ان کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد سمجھ میں آیا کہ اسلام کیا ہے، شیخ محمد امان فرماتے ہیں:...اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو ہدایت عطا فرمائی جو شیخ الاسلام پر رد و تنقید کرنا چاہتا تھا، پھر اس نے "ابن تيمية السلفي" کے عنوان سے اپنا دکتورہ کا مقالہ لکھا...[1]

ان واقعات اور قصوں کو بیان کرنے کا مقصد اس بات کی وضاحت اور اثبات ہے کہ انسان کے منہج اور فکر پر صحبت ومعاشرت اور تتلمذ وشاگردی کا بڑا گہرا اثر ہوتا ہے، خواہ وہ صحبت اور شاگردی کتابوں کی ہو یا انسانوں کی، اور خواہ منحرفین ومبتدعین کی ہو یا مصلحین اور متبعین سنت وحاملین منہج سلف صالحین کی، اس لئے ہر عقل مند اور باشعور انسان کو چاہیے کہ نیک صالح اور متبع سنت لوگوں کی صحبت اختیار کرے، منہج سلف صالحین کی نشر واشاعت کرنے والے اہل علم کی تقریریں اور لیکچرز سنے، انہی کی شاگردی اختیار کرے اور انہی کی کتابوں کا مطالعہ کرے، اور ہر قسم کے منحرف، بدعتی، خواہش پرست اور گمراہ لوگوں کی صحبت سے بچے، نہ ان کی باتیں سنے اور نہ ہی ان سے علم حاصل کرے تاکہ وہ بدعات وخرافات اور شکوک وشبہات سے محفوظ اور سنت وسلفیت پر قائم رہ کر زندگی گزار سکے۔

---

(۱)(شرح العقيدة الواسطية "للعلامة محمد أمان الجامي، الشريط الثاني إلى نهاية الدقيقة ٦:و ٤٠ ثانية https://youtu.be/FsPmJucfHAk)۔

منظومة البيقونية في مصطلح الحديث: تعارف اور شروحات (قسط ثانی)

ابو المدیح بلال الخلیلی
جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ

نسبت رسالہ:

چونکہ ابھی تک اس منظومہ کی جتنی شروحات وتعلیقات کی گئی ہیں، تمام شراح کرام اس رسالہ کی نسبت امام بیقونی کی طرف ہی کرتے آئے ہیں، گرچہ کہ صاحب منظومہ کی سوانح تاریخ وتراجم میں مذکور نہیں، اسی طرح اگر امام بیقونی رحمہ اللہ کے ہم عصر علماء کو دیکھیں جنہوں نے اس منظومہ کی شرح کی ہے، جیسے امام عبد القادر المحلی، امام حموی وغیرہ، تو انہوں نے بھی اس رسالہ کی نسبت امام بیقونی کی طرف ہی کی ہے، لیکن شیخ صالح العصیمی حفظہ اللہ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ یہ بیقونیہ مصحفہ ہے، اسی طرح کا قول محمد زیاد تکلہ کا بھی ہے، جس میں وہ کہتے ہیں کہ گیارویں صدی کے ایک شافعی امام "عمر بیلونی" گزرے ہیں جن کی وفات ١٠٢٧ھ کی ہے، شہر حلب کی مسجد اموی کے امام رہے ہیں، تو نساخ کی جانب سے یہ تحریف ہوئی کہ انہوں نے ان کی نسبت میں لام کے بجائے قاف کی زیادتی کردی۔ جواباً عرض ہے کہ ان کے قول پر کوئی ایسی دلیل یا قرینہ موجود نہیں ہے جس سے عمر بیلونی کی طرف اس رسالہ کی نسبت کی جائے، کیونکہ جتنے نسخے آج موجود ہیں، سب میں "البيقوني" ہی کا ذکر ہے۔

رسالہ منظومہ بیقونیہ:

ویسے فن علوم الحدیث پر کئی منظومات لکھی گئی ہیں جس میں ہر ایک نظم کی اپنی اپنی خصوصیت ہے، جیسے کہ امام اشبیلی کی نظم قصیدہ غرامی ہے، امام ابو الفضل کی نظم التبصرۃ والتذکرۃ ہے جو الفیۃ العراقی کے نام سے مشہور ہے، اسی طرح امام سیوطی کی الفیۃ الحدیث ہے، سوانہی منظومات میں منظومہ بیقونیہ بھی ہے جس کا نبذہ مضمون ہذا میں قارئین کے سامنے پیش خدمت ہے۔

یہ رسالہ "بحر رجز" پر لکھا گیا ایسا منظومہ ہے جو علوم الحدیث کے ٣٤ اقسام پر مشتمل ہے، جس کا نام مؤلف کی جانب سے "المنظومة البيقونية" رکھا گیا ہے، جس کی صراحت خود امام بیقونی رحمہ اللہ نے اپنے منظومہ کے آخر میں کی ہے کہ "سَمَّيْتُهَا: مَنْظُومَةَ الْبَيْقُونِي"۔

چونکہ یہ رسالہ فن مصطلح الحدیث پر ہے تو اس میں صرف اہم ومبادی ۳۴ مصطلحات ہی کو ذکر کیا گیا ہے جس کی وجہ سے علماء نے اس منظومہ کو بوابۃ الدخول الی علم الحدیث سے تعبیر کیا ہے، ان ۳۴ مصطلحات کا مجملاً تذکرہ من خلال المنظومۃ درج ذیل ہے:

حمد وصلاۃ کے بعد:

(۱) الصحیح: صحیح حدیث وہ ہے جس کی سند متصل ہو، اسے روایت کرنے والے راوی اول تا آخر عادل وضابط ہوں وہ شاذ یا معلل نہ ہو.

أَوَّلُهَا: الصَّحِيحُ وَهْوَ مَا اتَّصَلْ
إِسْنَادُهُ وَلَمْ يَشِذَّ أَوْ يُعَلْ
يَرْوِيهِ عَدْلٌ ضَابِطٌ عَنْ مِثْلِهِ
مُعْتَمَدٌ فِي ضَبْطِهِ وَنَقْلِهِ

(۲) الحسن: حسن وہ حدیث ہے جس کی سند متصل ہو، اسے نقل کرنے والے راوی اول تا آخر عادل ہوں، لیکن ضبط اور یادداشت خفیف اور کم ہو اور وہ حدیث معلل اور شاذ نہ ہو۔

وَالْحَسَنُ الْمَعْرُوفُ طُرْقًا وَغَدَتْ
رِجَالُهُ لَا كَالصَّحِيحِ اشْتَهَرَتْ

(۳) الضعیف: وہ خبر جو حسن کی خوبی اور صفت کو جمع نہ کر پائے، حسن کی شرطوں میں سے کسی شرط کے مفقود ہونے کے ساتھ۔

وَكُلُّ مَا عَنْ رُتْبَةِ الحُسْنِ قَصُرْ
فَهْوَ الضَّعِيفُ وَهْوَ أَقْسَامًا كُثُرْ

(۴) المرفوع: مرفوع سے مراد وہ قول، فعل، تقریر یا صفت جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو اور اس کی اضافت آپ کی طرف ہو۔

وَمَا أُضِيفَ لِلنَّبِيْ الْمَرْفُوعُ

(۵) المقطوع: مقطوع سے مراد وہ قول یا فعل جو تابعی یا اس سے نیچے طبقے والے کی طرف منسوب ہو۔

وَمَا لِتَابِعٍ هُوَ الْمَقْطُوعُ

(٦) المسند: مسند وہ حدیث جس کی سند نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع متصل ہو۔

والمسْنَدُ الْمُتَّصِلُ الإِسْنَادِ مِنْ
رَاوِيهِ حَتَّى المصْطَفَى وَلَمْ يَبِنْ

(۷) المتصل: متصل وہ مرفوع یا موقوف حدیث جس کی سند متصل ہو۔

وَمَا بِسَمْعِ كُلِّ رَاوٍ يتَّصِلْ
إِسْنَادُهُ لِلْمُصْطَفَى فَالْمُتَّصِلْ

(۸) المسلسل: مسلسل سے مراد اسناد کے رجال کا ایک صفت یا حالت پر تسلسل سے اور لگاتار ہونا یہ تسلسل کبھی راویوں کے لیے اور کبھی روایت کے لیے ہوتا ہے۔

مُسَلْسَلٌ قُلْ مَا عَلَى وَصْفٍ أَتَى
مِثْلُ: أَمَا واللهِ أَنْبَانِي الْفَتَى
كَذَاكَ قَدْ حَدَّثَنِيهِ قَائِمَا
أَوْ بَعْدَ أَنْ حَدَّثَنِي تَبَسَّمَا

(۹) العزیز: عزیز وہ حدیث ہے جس کے راوی سند کے تمام طبقوں میں دو سے کم نہ ہوں۔

عَزِيزُ مَرْوِيْ اثْنَيْنِ أَوْ ثَلَاثَهْ

(۱۰) المشہور: مشہور وہ حدیث ہے جسے ہر طبقے میں تین یا تین سے زیادہ روایت کریں مگر تواتر کی حد کو نہ پہونچے۔

مَشْهُورُ مَرْوِي فَوْقَ مَا ثَلَاثَهْ

(۱۱) المعنعن: راوی کا یہ کہنا کہ "فلاں عن فلاں"۔

مَعَنْعَنٌ كَعَنْ سَعِيدٍ عَنْ كَرَمْ

(۱۲) المبہم: مبہم وہ راوی جس کا نام حدیث میں واضح اور صراحت سے بیان نہ ہو۔

وَمُبْهَمٌ مَا فِيهِ رَاوٍ لَمْ يُسَمْ

(۱۳) العالي: عالی اسناد سے مراد وہ سند جس کے راویوں کی تعداد بہ نسبت دوسری سند کے کم ہو اسی حدیث کے وارد ہونے کے لحاظ سے۔

وَكُلُّ مَا قَلَّتْ رِجَالُهُ عَلَا

(۱۴) النازل: نازل وہ سند جس کے راویوں کی تعداد بہ نسبت اس حدیث کی دوسری سند کے زیادہ ہو۔

وَضِدُّهُ ذَاكَ الَّذِي قَدْ نَزَلَا

(۱۶) الموقوف: موقوف وہ قول، فعل یا سکوت جس کی اضافت صحابی کی طرف ہو۔

وَمَا أَضَفْتَهُ إِلَى الْأَصْحَابِ مِنْ
قَوْلٍ وَفِعْلٍ فَهْوَ مَوْقُوفٌ زُكِنْ

(۱۷) المرسل: مرسل وہ حدیث جس کے آخر سند میں تابعی کے بعد انقطاع ہو اور راوی حذف ہوں۔

وَمُرْسَلٌ مِنْهُ الصَّحَابِيُّ سَقَطْ

(۱۷) الغریب: غریب وہ حدیث جسے ایک منفرد راوی بیان کرے۔

وَقُلْ: غَرِيبٌ مَا رَوَى رَاوٍ فَقَطْ

(۱۸)المنقطع: منقطع وہ روایت جس کی سند متصل نہ ہو چاہے یہ انقطاع کسی بھی وجہ سے ہو۔

وَكُلُّ مَا لَمْ يَتَّصِلْ بِحَالِ
إِسْنَادُهُ مُنْقَطِعُ الأَوْصَالِ

(۱۹)المعضل: معضل وہ روایت جس کی سند سے دو یا دو سے زیادہ راوی مسلسل حذف اور ساقط ہوں۔

وَالْمُعْضَلُ السَّاقِطُ مِنْهُ اثْنَانِ

(۲۰)التدلیس: تدلیس کی دو قسمیں ہیں:

۱-تدلیس اسناد: راوی حدیث اس استاد سے بیان کرے جس سے اس نے یہ حدیث سنی نہیں اس کو ذکر کئے بغیر جس سے اس نے یہ حدیث سنی ہے۔

۲-تدلیس شیوخ: راوی اپنے شیخ سے وہ حدیث بیان کرتا ہے جو کہ اس نے اس سے سنی ہوتی ہے لیکن شیخ کو اس نام یا کنیت یا نسب یا وصف سے بیان کرتا ہے جس کے ساتھ وہ نہیں ہوتا، تاکہ وہ شیخ پہچانا نہ جاسکے۔

وَمَا أَتَى مُدَلَّسًا نَوْعَانِ
الأَوَّلُ: الإِسْقَاطُ لِلشَّيْخِ وَأَنْ
يَنْقُلَ مِمَّنْ فَوْقَهُ بِعَنْ وَأَنْ
وَالثَّانِي: لَا يُسْقِطُهُ لَكِنْ يَصِفْ
أَوْصَافَهُ بِمَا بِهِ لَا يَنْعَرِفْ

(۲۱)الشاذ: شاذ وہ روایت ہے جسے مقبول اور ثقہ راوی بیان کرے جس میں وہ اپنے سے بہتر اور اوثق کی مخالفت کر رہا ہو۔

وَمَا يُخَالِفْ ثِقَةٌ فِيهِ الْمَلَا
فَالشَّاذُ ---------

(۲۲)المقلوب: مقلوب سے مراد حدیث کی سند یا اس کے متن میں تقدیم یا تاخیر وغیرہ کرکے ایک لفظ کو دوسرے لفظ کے ساتھ بدل لینا۔

وَالْمَقْلُوبُ قِسْمَانِ تَلَا
إِبْدَالُ رَاوٍ مَا بِرَاوٍ قِسْمُ
وَقَلْبُ إِسْنَادٍ لِمَتْنٍ قِسْمُ

(۲۳)الفرد: فرد وہ حدیث ہے جسے ایک منفرد راوی بیان کرے۔

وَالْفَرْدُ مَا قَيَّدْتَهُ بِثِقَةِ

أَوْ جَمْعٍ أَوْ قَصْرٍ عَلَى رِوَايَةِ

(٢٤) المعلل: معلل وہ حدیث جس میں ایسی علت معلوم ہو جائے جو اس کی صحت میں ضعف کا سبب ہو اگرچہ ظاہراً وہ عیب سے سلامت معلوم ہو۔

وَمَا بِعِلَّةٍ غُمُوضٍ أَوْ خَفَا
مُعَلَّلٌ عِنْدَهُمُ قَدْ عُرِفَا

(٢٥) المضطرب: مضطرب وہ حدیث جو ایسے مختلف طریقوں سے مروی ہو جو قوت میں مساوی اور برابر ہوں۔

وَذُو اخْتِلافِ سَنَدٍ أَوْ مَتْنِ
مُضْطَرِبٌ عِنْدَ أُهَيْلِ الفَنِّ

(٢٦) المدرج: مدرج یعنی جس حدیث کی سند کا سیاق بدلا گیا ہو یا اس کے متن میں بغیر فرق و وضاحت کئے ایسی چیز داخل کر دی گئی ہو جو اس کا حصہ نہیں۔

وَالْمُدْرَجَاتُ فِي الحَدِيثِ مَا أَتَتْ
مِنْ بَعْضِ أَلْفَاظِ الرُّوَاةِ اتَّصَلَتْ

(٢٧) المدبج: مدبج وہ ہے کہ دو قرینوں (ساتھیوں) میں سے ہر ایک دوسرے سے روایت کرے۔

وَمَا رَوَى كُلُّ قَرِينٍ عَنْ أَخِهْ
مُدَبَّجٌ فَاعْرِفْهُ حَقًّا وَانْتَخِهْ

(٢٨) المتفق: متفق یعنی راویوں اور ان کے باپوں کے نام اور اوپر تک کے نام خط اور تلفظ میں متفق ہوں جب کہ اشخاص مختلف ہوں، ایسے ہی ان کے نام اور کنیتیں یا ان کے نام اور نسبتیں وغیرہ متفق اور ایک جیسی ہوں۔

مُتَّفِقٌ لَفْظًا وَخَطًّا مُتَّفِقْ

(٢٩) المفترق: مفترق مذکورہ متفق کی ضد مفترق کہلاتی ہے۔

وَضِدُّهُ فِيمَا ذَكَرْنَا الْمُفْتَرِقْ

(٣٠) المؤتلف: مؤتلف یعنی راویوں کے نام یا لقب یا کنیتیں یا نسب اور نسبتیں خط میں متفق ہوں اور تلفظ میں مختلف ہوں۔

مُؤْتَلِفٌ مُتَّفِقُ الْخَطِّ فَقَطْ

(٣١) المختلف: مختلف مذکورہ مؤتلف کی ضد مختلف کہلاتی ہے۔

وَضِدُّهُ مُخْتَلِفٌ فَاحْشَ الغَلَطْ

(٣٢) المنکر: منکر وہ روایت ہے جس میں ضعیف راوی ثقہ کی مخالفت کر رہا ہو۔

وَالْمُنْكَرُ الفَرْدُ بِهِ رَاوٍ غَدَا

تَعْدِيلُهُ لَا يَحْمِلُ التَّفَرُّدَا

(۳۳)المتروک: متروک وہ حدیث جس کی سند میں متہم بالکذب راوی ہو۔

مَتْرُوكُهُ مَا وَاحِدٌ بِهِ انْفَرَدْ

وَأَجْمَعُوا لِضَعْفِهِ فَهْوَ كَرَدْ

(۳۴)الموضوع: موضوع وہ بنایا یا گھڑا ہوا جھوٹ جس کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہو۔

وَالْكَذِبُ الْمخْتَلَقُ الْمَصْنُوعُ

عَلَى النَّبِيْ فَذَلِكَ الْمَوضُوعُ

یہ علم اصول حدیث کے وہ مصطلحات ہیں جن کی معرفت سے حدیث کے صحت وضعف کا پتہ لگایا جاتا ہے نیز جن کے ذریعہ سے سند ومتن کی تحقیق کی جاتی ہے۔ لیکن صاحب منظومہ نے اس نظم میں جمیع اقسام اصول حدیث کا احاطہ واستیعاب نہیں کیا، ہاں البتہ اہم مبادی اقسام کا ذکر ضرور کیا ہے۔ جس کو ایک مبتدی طالب حدیث یاد کر کے اس فن میں تدریجا پہلا زینہ طے کر سکتا ہے۔

شیخ عبد الکریم الخضیر حفظہ اللہ فرماتے ہیں کہ: یہ منظومہ فن مصطلح الحدیث میں اختصار مخل ہے کہ کچھ اہم اقسام علوم حدیث اس میں ناپید ہیں، لہذا ایک طالب کو اس کے ساتھ یا تو الفیہ عراقی حفظ کرنی چاہیے یا منظومہ نخبۃ الفکر للصنعانی (قصب السکر) یاد کرنی چاہیے تاکہ اکثر اصول الحدیث ازبر ہوں اور فہماً وتطبیقاً سمجھ آسکیں۔

A PEN WHICH HAS BEEN RAISED TO ASSIST, DEFEND THE PEOPLE OF TRUTH AND REFUTE FALSEHOOD AND ITS PROPONENTS IS THE BEST KIND.

(Imam Ibn Qayyim Rahimahullah: Al-Tibyan Fi Aemanil Qur'aan, Pg: 310)

Issue ②

Monthly

Manhaj E-Salaf MAGAZINE

Edition-1 | Issue-2 | Shaban 1444 | February-March 2023

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيَأْتِيَنَّ عَلَى أُمَّتِي مَا أَتَى عَلَى بَنِي إِسْرَائِيلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ حَتَّى إِنْ كَانَ مِنْهُمْ مَنْ أَتَى أُمَّهُ عَلَانِيَةً لَكَانَ فِي أُمَّتِي مَنْ يَصْنَعُ ذَلِكَ وَإِنَّ بَنِي إِسْرَائِيلَ تَفَرَّقَتْ عَلَى ثِنْتَيْنِ وَسَبْعِينَ مِلَّةً وَتَفْتَرِقُ أُمَّتِي عَلَى ثَلَاثٍ وَسَبْعِينَ مِلَّةً كُلُّهُمْ فِي النَّارِ إِلَّا مِلَّةً وَاحِدَةً قَالُوا وَمَنْ هِيَ يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي. (سنن الترمذي: 2641)

NARRATED 'ABDULLAH BIN 'AMR: THAT THE MESSENGER OF ALLAH (ﷺ) SAID: "WHAT BEFELL THE CHILDREN OF ISRA'IL WILL BEFALL MY UMMAH, STEP BY STEP, SUCH THAT IF THERE WAS ONE WHO HAD INTERCOURSE WITH HIS MOTHER IN THE OPEN, THEN THERE WOULD BE SOMEONE FROM MY UMMAH WHO WOULD DO THAT. INDEED THE CHILDREN OF ISRA'IL SPLIT INTO SEVENTY-TWO SECTS, AND MY UMMAH WILL SPLIT INTO SEVENTY-THREE SECTS. ALL OF THEM ARE IN THE FIRE EXCEPT ONE SECT." HE SAID: "AND WHICH IS IT O MESSENGER OF ALLAH?" HE SAID: "WHAT I AM UPON AND MY COMPANIONS."

www.salafimanhaj.info